

شکرِ عالیٰ

از

پرتو کی چندر
بہارِ بس پختہ سہلی

بار اول ۱۳۰۰

مئی ۱۹۲۰ء

مطبوعہ پیام وطن پریس دہلی - ناشر پرتھوی چند

فکرِ غالب

نیو تاج آفیس اردو بازار دہلی

قیمت ستر

مرزا غالب



آتے ہیں غیب سے یہ منشا میں خیال میں

پیشکش

میں اپنی ناچیز تصنیف کو جناب علامہ مہر لاج صاحب سامانی،
ممتاز سینیئر ایڈووکیٹ و ہٹی کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

جن کو باوجود اپنی گونا گوں مصروفیات کے

مرزا غالب کے کلام سے خاص دلچسپی ہے اور مرزا غالب
کے اشعار کی بہترین شرح سے واقف ہیں اور مرزا غالب کے
اطلاک و ظرائف سے ادبی صحبت کو نہایت دلچسپ اور
پرکیت بنا دیتے ہیں۔

ۛ گر قبول افتد ہے عذو شرف
پر تھوی چہند

کچھ نصحا و پر کے متعلق

اس کتاب میں مرزا غالب کے متعلق چار تصویریں دی گئی ہیں۔
(۱) مرزا غالب کی تصویر۔

(۲) تصویر بچے ولادت مرزا غالب بمقام اگرہ۔

یہ مقام ہال محل (کلاں محل) کے نام سے مشہور ہے جو پیل منڈی
اگرہ میں اب بھی موجود ہے۔ جہاں مرزا غالب پیدا ہوئے اور شادی
ہونے تک اپنی والدہ کے ہمراہ اپنے نانا خواجہ مرزا غلام حسین کے یہاں رہے۔
(۳) مرزا کی جائے رہائش بمقام وہلی۔

یہ اس مسجد کی تصویر ہے جس کے عقب میں مرزا غالب کرایہ پر مکان لیکر
اپنی عمر کے آخر لمحات تک مقیم رہے۔ اور جس کے متعلق مرزا غالب نے ایک
شعر کہا تھا۔ مسجد کے زیر سایہ اک گھر بنا لیا ہے۔

(۴) آخر میں اکی تصویر مرزا غالب کے مزار کی ہے جو حضرت نظام الدین اولیا
کے مزار سے کچھ فاصلے پر مشرق کی طرف واقع ہے۔

یہ مزار پہلے خستہ حالت میں تھا جس کو نئے سرے سے سنگ مرمر
تعمیر کیا گیا ہے۔

فکر غالب

از جناب تلوک چند محروم صاحب

نئی دلی کے ممتاز تاجہ شری پر نھوی چمن دکنی تابع فکر غالب کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نے کلام غالب کا یہ فطری طور مطالعہ ہی نہیں کیا بلکہ مرزا کے نام اور کلام سے عشق ہے۔ یہ کتاب غالب سے بڑے بچوں میں ایک مفید اور دلچسپ اضافہ ہے۔ اس میں مرزا غالب کے حالات زندگی، عادات، وخصائل اور خصوصیات کلام و غیرہ کے بڑے بڑے سیر حاصل محنت کی گئی ہے۔ مرکزی باب جو اہل صفیات پر مشتمل ہے۔ ایک نظر کی توجہ کا خاص طور پر مستحق ہے۔ یہ باب غالب کے اس سفر کی توسیع معلوم ہوتا ہے۔ ! ع

غالب کو بڑا کیوں کہہ اچھا مرے آگے

اس میں غالب کے نقادوں اور شارحین پر تنقید کی گئی ہے

جو دیکھپ ہونے کے علاوہ خیال انگیز بھی ہے۔
 علاوہ انہیں مرزا کے چند ضروری خطوط بھی شامل ہیں جن کا
 مرزا غالب کی زندگی اور اثر پر روشنی ڈالتا ہے۔ اکثر دیوان غالب کا
 انتخاب بھی دے دیا گیا ہے جو مؤلف کی ذوق سلیم کا مظہر ہے۔
 غرض مرزا غالب کے حالات اور ان کے کلام سے لطف اندوز
 ہونے والے حضرات کے لئے یہ کتاب ذریعہ مسرت اور طلباء کے لئے
 ایک مفید امدادی کتاب ثابت ہوگی۔

ملوک چند محرم
 ۲۲ مارچ ۱۹۶۰ء

فکر غالب

از جناب امتیاز علی عسری رام پور

مکرم نامہ اور "فکر غالب" دونوں نے میری عزت بڑھائی
کتاب پڑھکر میں حیرت میں پڑ گیا کہ آپ نے کس چابک دستی سے اپنے
لئے غالب کے کام کرنیوالوں میں ایک عمدہ مقام حاصل کر لیا شاید
یہ اچھوتا انداز کسی کے ذہن میں بھی نہ آیا ہوگا۔ کم از کم میں تو اس
کے دیکھنے سے پہلے یہ نہ سوچ سکا کہ اس ڈھنگ پر بھی کوئی دلچسپ
کتاب غالب پر لکھی جاسکتی ہے۔ خدا آپ کو مزید کام کی توفیق عطا
فرمائے۔

غالب کے دیوان کے بارے میں آپ کی جو سکیم ہے مجھے اس کے
کلی اتفاق ہے۔ آپ خدا کا نام لے کر یہ کام شروع فرما دیجیئے
اور اس کام میں کوئی مشورہ مجھ سے کرنا ضروری ہو تو بلا تکلف
لکھئے میں حاضر ہوں۔ ہر خدمت بجا لاؤں گا۔

انجمن علمیہ

مخلص :-

عسری



پرکھوی چندر

ویساچہ

جب سے دُنیا قائم ہوئی ہے اس کے ہر دور میں ایسی قابل ترین ہستیاں پیدا ہوتی رہی ہیں جو اپنی ادنیٰ خدمات اور درخشاں کارناموں کی وجہ سے زندہ جاوید ہیں اگلے والی نسلیں ہمیشہ ان کے کارناموں پر فخر کرتے ہوئے عقیدت کے پھول ان پر بچھاؤں گرتی رہیں گی۔ فلسفہ اور حکمت میں بقراط، سقراط۔ ارسطو اور افلاطون شاعری میں فردوسی، ظہوری، سعدی۔ سوز۔ میر تقی میر۔ دیاندریشیم اور ذوق اور شرمکاری میں اور انشا پر وازی میں رجب علی بیگ سرود۔ پندت رتن ناتھ مرشار۔ ڈپٹی نذیر احمد مولانا محمد حسین آزاد۔ منشی پریم چند اپنے درخشاں کارناموں کی وجہ سے تمام عالم میں مشہور ہیں۔ ان ہی مشہور ہستیوں میں سے مرزا غالب بھی تھے۔ جواب سوا سو سال پشتر ظفر بادشاہ کے زمانے میں ہوئے اور مومن ذوق لو اب شیفتہ مولانا آذر وہ ان کے ہم عصر تھے۔

ولی سے لیکر مومن اور ذوق کے زمانے تک بیشمار شاعر نظر آتے ہیں لیکن غالب کی شاعری کا رنگ سب سے جدا ہے وہ رفعت خیال جدت بیان اور گونا گوں خصوصیات کی وجہ سے اپنے ہم عصر اور شاعر

مستقدمین اور متاخرین میں ممتاز نظر آتے ہیں۔ ان کے بعض ہم عصر و
 کا کلام تذکروں ہی تک محدود رہ گیا ہے لیکن مرزا غالب نے ہفتیاں
 شاعری میں ایسے سدا بہار پھول کھلائے ہیں جن کی خوشبو ابھی تک
 چلی آتی ہے اور ہمیشہ رہے گی۔

شیکیپیر اپنے زمانے میں ایک مہولی اکبر اور ڈرامہ نویس تھا۔
 لیکن مرنے کے بعد اس کے ڈرامے لافانی شاہکار سمجھے جاتے ہیں اور
 اس کے ڈراموں اور ادبی مضامین کو نہایت اعلیٰ طباعت کے ساتھ
 شائع کیا جاتا ہے اور شیکیپیر اپنے زمانے سے اب زیادہ مشہور اور
 ممتاز ہستی شمار کی جاتی ہے اسی طرح شیخ سعدی جو گلستاں اور
 بوستاں کے مصنف تھے اپنے زمانہ میں مشہور نہ ہو سکے لیکن آج کل
 ان کو مسلم البوث شاعر مانا گیا ہے ان کی تصانیف گلستاں بوستاں
 کا تمام دنیا میں چرچا ہے۔

مرزا غالب بھی ایک ایسے شاعر تھے جو اپنے زمانے میں ان کے معاصر
 شاعروں نے ان کو سبقت نہ لینے دی اور کوئی ادبی جھگڑا اور
 فساد برپا کئے رکھا۔ مگر زمانے نے وقت آئے پرانگی قدر کی اور ہو رہی ہے
 اور آج کل اپنی ہندو سرکار نے اسی شاعر کے کلام اور ادبی خدمات کو سراہا
 ڈاک کے ٹکٹوں پر ان کی تصاویر شائع ہوئیں۔ اور قوم کی طرف سے ہر سال
 برسی منائی جاتی ہے۔ ہندوستان کے تمام ریڈیو اسٹیشنوں پر ان کا کلام
 ادھ حالات نشر کئے جاتے ہیں ان کا مراد حضرت نظام الدین اولیاء کے مراد

کے نزدیک خستہ حالت میں تھی بلکہ بڑا دلان سا تھ شامی کر لیا گیا اور
 اور اسی کا فرش سنگ مرمر سے خوشنما بنا دیا گیا ہے اور مزار کو نئے مرمر سے
 سنگ مرمر سے مزین کیا گیا ہے لوگ جو دہلی دیکھنے کے لئے آتے ہیں ان کے
 لئے اور تمام ہندوستان اور غیر ممالک کے لئے ایک زیارت گاہ بن گئی ہے
 مرزا کو اپنی زندگی میں پریشانیوں کا خوب مقابلہ کرنا پڑا جس کا ذکر
 کتاب ہذا میں آتا ہے اپنی زندگی میں ہمیشہ تنگدستی سے مقابلہ کرنا پڑا۔
 اور ان کی قدر و منزلت نہ ہوئی جس کے کہ وہ لائق تھے۔ اگرچہ
 نواب راقم پور نے مرزا غائب کی بہت مدد کی جب تک مرزا
 زندہ رہے مگر وہ بے ماہوار تنخواہ ملتی رہی۔ تنخواہ کے علاوہ
 نواب صاحب وقتاً فوقتاً مرزا غائب کی مالی امداد بھی
 کرتے رہے۔ اگر یہ مدد نہ ہوتی تو نہ معلوم مرزا کو کتنی مصالحت اور پریشانیوں
 کا مقابلہ کرنا پڑتا۔

مگر یہ قدر و منزلت اُس پرزال کی سی تھی جو ایک سوت کی اٹی لے کر
 یوسف کو بازار سے خریدے گئی تھی جیسا کہ مرزا غائب نے بھی لکھا ہے۔

جو چاہتے نہیں وہ میری قدر و منزلت
 میں یوسف بقیہ اول خریدہ ہوں

مرزا صاحب کے شاگردوں کا سلسلہ تمام ہندوستان میں پھیلا ہوا
 تھا۔ جو اپنا کلام اصلاح کے لئے ان کے پاس بھیج دیتے تھے۔ ان کے

شاگردوں میں سے چند شاگردوں کے نام نامی یہ ہیں۔
(۱) مولانا حالی۔ مصنف مقدمہ شعر و شاعری و یادگار غالب

(۲) مولانا اسماعیل میرٹھی جن کی اردو ریڈریں لاجواب سمجھی جاتی ہیں۔

(۳) نواب شیفتہ۔ جو مرزا غالب کے بڑے دوست تھے اور اردو فارسی کے زبردست شاعر تھے۔

(۴) ہرگوپال تفتہ۔ جن کو مرزا غالب مرزا صاحب کہہ کر پکارتے تھے اور جن کو مرزا غالب نے سب سے زیادہ خطوط لکھے تھے۔

(۵) منشی شوناز ام آرام۔ جو آگرہ میں ایک مشہور مطبع کے مالک تھے جن کے خاندان اور اپنے خاندان کے آمیزش کے تعلقات کا احوال خود مرزا صاحب نے ایک خط میں مفصل دیا ہے۔

(۶) میر مہدی مجروح۔ جن کو مولانا غالب نے محبت آمیز خطوط سب سے زیادہ لکھے ہیں۔

(۷) جوہر سنگھ امراتہ سنگھ۔ دونوں گئے بھائی اور دونوں تحصیلدار تھے اور غالب سے ان کی خاص عقیدت تھی۔

(۸) بہاری لال عاصی۔ جنہوں نے گلستان اور بوستاں کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا ہے۔

(۹) راجو بہر گوہند سہاسی نشاط۔ اصل وطن پٹنہ تھا مگر آگرہ آکر گوہند کچ آباد کیا۔ دیوان نشاط کے علاوہ بہت سی تصانیف چھوڑیں۔

گودلی کے تعلیم یافتہ طبقوں میں مرزا غالب کے کلام کی قابلیت کو تسلیم کیا گیا
 مگر ظفر بادشاہ نے غالب کی قابلیت سے متاثر ہو کر ان کو اپنے ولی عہد مرزا جواں
 بخت کا اتالیق مقرر کیا اور چار سو روپیہ سالانہ مشاہیرانہ مقررہ ہوا۔ جب کہ
 ذوق چار روپیہ ماہوار پر ظفر بادشاہ کی ولی عہدی کے زمانے میں استاد
 مقرر ہوئے۔ اس کے علاوہ ظفر بادشاہ نے مرزا غالب کو نجم الدولہ و پیر الملک
 کا خطاب دے کر شاہان تیموریہ کی تاریخ بربان فارسی لکھنے پر مامور کیا۔
 حالانکہ یہی خدمت وہ دوسرے شعراء اور ادیبوں سے بھی لے سکتے تھے
 مگر بادشاہ نے اس خدمت کے لئے مرزا غالب ہی کو اہل سمجھا اور جس سے
 ظاہر ہوا کہ مرزا غالب کو اپنے تمام معصروں پر سبقت حاصل تھی۔

سودا، میر تقی، مرزا غالب ہی ایسے شاعر ہیں جو موجود زمانے
 میں اپنے زمانے سے زیادہ مشہور ہیں یوں تو مومن اور ذوق کا کلام بھی
 موجود ہے لیکن مرزا غالب کے کلام میں آخر وہ کیا خوبی ہے جس کی وجہ سے
 ان کے کلام کی بے شمار شرحیں لکھی گئیں ہیں اور لکھی جاتی ہیں اور ان کے
 دیوان کے کئی قسم کے ایڈیشن شائع ہوتے رہتے ہیں۔

شارحین کی شرح نظر سے گزریں اور مصنفوں نے مرزا کے کلام کو
 دوسرے معصروں کے کلام سے کم تر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے بعض نے
 ان کے کئی اشعار کو مہمل قرار دیا ہے۔ اور بعض نے ان کے کلام میں اس
 طرح اصلاح فرمائی ہے جیسے ایک کا بل استاد اپنے ایک معقد شاعر کو
 کہ اصلاح دینا ضروری سمجھتا ہے ان حضرات نے مرزا کے کلام کے مقابلہ

میں دوسرے مہموروں کے کلام کو سراہا اور خواہ مخواہ موزن کیا اور جو کچھ انہوں نے غالب کی مخالفت میں لکھا ہے وہ صحیح نہیں ہے، بلکہ جانبداری ہے۔

جو حضرات مرزا غالب اور ان کے مہموروں کا مقابلہ کرتے ہیں وہ کوئی ادبی خدمت انجام نہیں دیتے، بلکہ ان کے کلام میں رخنہ پیدا کرتے ہیں۔ ان عالم ہستیوں کی عزت کو ٹکھٹاتے ہیں مقابلہ کرنے میں ان کی خوبیاں اور اوصاف مدغم پڑ جاتے ہیں اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ستاروں کی روشنی، مانتاب کی روشنی سورج کی روشنی اپنی اپنی جگہ پر ایک روشنی چمک رہی ہے لیکن اگر کوئی شخص ان روشنیوں کا مقابلہ کرنے لگے تو آپ اسے کیا کہیں گے۔ ستارے، چاند اور سورج اپنی اپنی جگہ پر ہیں اور یہی فرق کلام غالب میں اور ان کے مہموروں کے ساتھ ہے۔ مقابلہ ہمیشہ یکساں چیزوں کا ہونا چاہئے ان کے مہمور بے شک نہایت بلند پایہ کے شاعر تھے ان کے کلام میں بھی پیچیدہ رفعت خیال اور غماز مضمون موجود ہیں لیکن اپنی اپنی جگہ پر بلند تر ہے کلام غالب کے متعلق جس کے بڑے بڑے ادیب اہل قلم انشاء پرواز اور شعراء ہمیشہ غالب ہی کے کلام کی شرح لکھ رہے ہیں ورنہ دوسرے شعراء کے دیوانوں کی شرح لکھی جاسکتی ہے۔ مرزا غالب کی اپنی گونا گوں خصوصیات کے علاوہ شوخی و ظرافت ان کے مضامین، وحدت الوجود، معرفت کے اشعار حضرات صوفیہ کی مجالس میں وجد اور کیفیت پیدا کرتے ہیں مرزا کی شاعری تجنیل اور جدت بیان کا اعلیٰ نمونہ ہے اور صحیح ہے کہ مرزا غالب کے تجنیل کی پرواز

جہاں پہنچتی ہے وہاں دوسرے شعرا کا گزر نہیں ہوا۔

تنقید نگار مومن کی ایک غزل اور ذوق کا ایک سہرا ملے کر کلام غالب کا مقابلہ کرتے ہیں یہ مقابلہ آپ کو مفصل کتاب کے اندر دکھلایا گیا ہے اگر ان پاکمالوں کے دیوانوں اور ان کی تمام غزلوں کا مقابلہ کیا جاتا تو کوئی بات بھی صرف ایک غزل اور ایک سہرے سے ہی غالب کی بے مثال شاعری کا کیا مقابلہ ہو سکتا ہے۔

اس کتاب میں غالب کے کلام پر تنقید نگاروں پر تنقید کی گئی ہے جس کے مطالعہ سے آپ پر عیاں ہو جائے گا کہ ان حضرات نے غالب کے مقابلہ میں دوسرے مہجروں کی بے جا جانب داری کی اور کسی خاص جذبہ کے تحت ایسا کر لے پر مجبور ہوئے۔ ورنہ مولانا محمد حسین آزاد شاگرد رشید حضرت ذوق جب تک زندہ رہے کلام غالب کو ملک پرورش نہ ہونے دیا۔ باوجود ایسا ہونے کے ان کے کلام کو کتنی مناخاں تھیں لکھا ہے کہ موجودہ وہ منتخب دیوان غالب ہے جس کو ہم عینک کی طرح آنکھوں سے لگائے پھرتے ہیں۔

کتاب آب حیات میں بیان غالب میں ایسی ایک سطر کلام غالب کے تعلق لکھ کر حقیقت بیان کر دی، یہی الفاظ وہ اپنے استاد ذوق مرحوم کے لئے بھی استعمال کر سکتے تھے بھلا ہو حضرت حالی کا جنہوں نے یادگار غالب لکھ کر ادیبوں کے لئے ایک شاہراہ عام بنا دی اور ملک کے ہر ادیب نے کلام غالب پر شرح لکھنی شروع کر دی اور ملک میں کلام غالب ہی کی دھوم مچ گئی اور شرح لکھنے والوں نے لکھا، خوب لکھا۔

چونکہ بعض ادیبوں نے جا بجا ادبی سے کام لیا ہے اور یہی وجہ یہ کتاب لکھنے کا موجب ہوئی مثلاً جوش ملیح آبادی نے شرح لکھ کر ادبی خدمت کی ہے اور ایک محقق شرح لکھی۔ مگر موازنہ ذوق و غالب میں ذوق کو سراہنے پر غالب کے ہر کلام پر اختلاف ظاہر کیا ہے اور ان کے اشعار کو مہل بھی لکھا جس کی تفصیل کتاب میں بیان کی گئی ہے۔

اس کتاب آپ کو اس زمانہ کا تہذیب و تمدن و واقعات غدر کا حال معلوم ہوتا ہے اور اس کے علاوہ مرزا غالب کا احوال ان کے اپنے خطوط و عود و ہندی اور اردو و معلیٰ سے ہی ظاہر ہوتے ہیں اور چند خطوط کتاب ہدایں غزلوں کے علاوہ بھی شامل کر دیئے گئے ہیں اور بہت سے اشعار بھی علیحدہ درج کئے گئے ہیں جس کا کلام غالب کی غزل گوئی و شہساز کی بھی پوری واقفیت ہو جاتی ہے کتاب ہذا لکھنے کا مقصد تنقید نگاروں پر تنقید کرنے کا نہیں اور نہ کسی قسم کی شکر رنجی پیدا کرنے کا مدعا ہے بلکہ آئندہ شرح لکھنے والے اصحاب سے درخواست ہوگی کہ جا بجا ادبی بہر صورت ایسے ادبی کام میں نہ لانی چاہئے کتاب ہذا لکھنے کے لئے بہت سی شرحوں اور ہر طرح کی کتابوں سے جو احوال غالب سے تعلق رکھتی تھیں مدد لی گئی ہے اور خاص کو خیاب فیاض حسین جامی کا شکریہ کیا جاتا ہے جنہوں نے اس کام میں پورے دل و دھن سے دیکھی کا اظہار کیا۔

اس کتاب میں حضرت جوش ملیح آبادی اور حضرت طباطبائی کی شرح دیوان غالب پر بھی تنقید کی گئی ہے لیکن دونوں حضرات اپنی اپنی جگہ زبردست ادیب اعلیٰ پایہ کے شاعر اور اعلیٰ قابلیت کے مظہر ہیں۔ اس تنقید سے ان دونوں بزرگوں کی قابلیت اور اہلیت پر کوئی حرف نہیں آتا۔

پرستوی چندر

مرزا اسد اللہ بیگ خاں غالب کے حالات زندگی

مرزا کے آباؤ اجداد مرزا ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے تھے انہوں نے خود لکھا

ہے کہ میر اسلم نسب توران بن فریدون سے ملتا ہے۔

زمانہ قدیم میں پیشدادی ایران کا مشہور خاندان تھا جس کا بانی کیومرث تھا ایرانی اس کو نبی مانتے تھے۔ اور اس کی بڑی عزت کرتے تھے شہر بہانے کی رسم اس کے ڈالی تھی۔

کیومرث کی وفات کے بعد اس کا پوتا ہوشنگ تخت پر بیٹھا۔ یہ بہت عادل اور رعایا پرور بادشاہ تھا اسی لئے رعایا نے اسے پیشداد "عادل اول" کے لقب سے سرفراز کیا اور اسی وجہ سے اس خاندان کا نام پیشدادی پڑ گیا۔

فردوسی کے قول کے مطابق اسی بادشاہ کے عہد میں سب سے

پہلے آگ دریافت ہوئی جو دو پتھروں کی رگڑ سے پیدا ہوتی تھی۔ اسی بادشاہ کے زمانے سے ایران میں آتش پرستی کی ابتدا ہوئی۔

ہوشنگ کے بعد تیمورس اور اس کے بعد جمشید تخت نشین ہوا۔ "جام جم" جس سے شرابیہ کلام کو زینت سمجھتے ہیں اسی بادشاہ کے عہد میں تیار کیا گیا۔ اسی کے زمانے سے جشن نوروز کی ابتدا ہوئی شراب انگور بھی اسی کے زمانے میں ایجاد ہوئی۔

جمشید کے آخری زمانے میں ایک شخص صحاہک نے بغاوت کی اور جمشید کو پکڑ کر آریے سے جبر کر مڑا ڈالا اور خود تخت پر بیٹھ گیا لیکن وہ بڑا ظالم تھا رعایا اس کے ظلم سے تنگ آ گئی اسے تخت سے اتار کر جمشید کے پوتے فریدون کو اپنا بادشاہ بنالیا اسی بادشاہ کے عہد میں کاوہ آہنگر نے ایران کا مشہور جھنڈا (درفش کاویانی) بنایا۔ ایران میں سب سے پہلا آتشکدہ اسی بادشاہ کے عہد میں تیار ہوا۔ اور یہی بادشاہ مرزا غالب کا جدِ اعلیٰ تھا۔

اس کے بعد کیا نیوں کا عروج ہوا حکمران خاندان کے معزز لوگ وطن چھوڑ کر ادھر ادھر منتشر ہو گئے ان کے بعض افراد نے ایک عظیم الشان سلطنت قائم کر لی۔ جو سلجوقی سلطنت کے نام سے مشہور ہے جس کے بادشاہوں میں الپ ارسلان۔ ملک شاہ اور سنجر بہت مشہور ہیں۔

جب اس سلطنت کو بھی زوال آ گیا تو اس خاندان کے افراد پھر منتشر اور پراگندہ ہو گئے ان میں ایک شہزادہ ترکم خاں تھا جس نے

سمرقند میں اقامت اختیار کی یہی شخص مرزا غالب کا پردادا تھا۔
 مرزا غالب کے دادا قوقان بیگ خاں کسی بات پر اپنے باپ سے
 ناراض ہو کر شاہ عالم کے عہد میں سمرقند سے ہندوستان چلے آئے۔ ان
 کی زبان ترکی تھی ہندوستان کی کوئی زبان نہیں جانتے تھے اعلیٰ خاندان
 سے تعلق رکھتے تھے اس لئے ملازمت ملنے میں وقت نہیں ہوئی وہ پہلے
 لاہور میں نواب حسین الملک کے پاس ملازم ہوئے ان کی وفات کے بعد
 نواب ذوالفقار الدولہ کی وساطت سے شاہ عالم کی حکومت میں ان کو
 پنجاب سوار تقارہ اور نشان کے ساتھ ملازمت مل گئی اور پرگنہ ہاسوان
 کی ذات اور رسالے کی تنخواہ کے لئے مقرر ہوا اور انھوں نے مستقل طور پر
 دہلی میں اقامت اختیار کر لی۔

قوقان بیگ کی سات اولادیں تھیں چار بیٹے اور تین لڑکیاں
 چار بیٹیوں میں سے ایک کا نام نصر اللہ خاں تھا۔ اور ایک کا نام مرزا عبداللہ
 بیگ اور یہی مرزا عبداللہ بیگ خاں مرزا غالب کے والد بزرگوار ہیں۔

یہ دہلی میں پیدا ہوئے جب
مرزا عبداللہ بیگ خاں تک ان کے والد قوقان بیگ خاں
 زندہ رہے بڑے آرام سے زندگی بسر کرتے رہے ان کی شادی خواجہ
 مرزا غلام حسین خاں کی صاحبزادی عشرت النساء بیگم سے ہوئی تھی خواجہ
 غلام حسین خاں کمیدان ایک فوجی افسر تھے اور آگرہ کے ایک معزز خاندان سے
 تعلق رکھتے تھے۔ آگرہ میں ان کی کافی جائیداد تھی مرزا عبداللہ بیگ خاں

اپنی سسرال میں مرزا دولہا کے نام سے مشہور تھے ۔

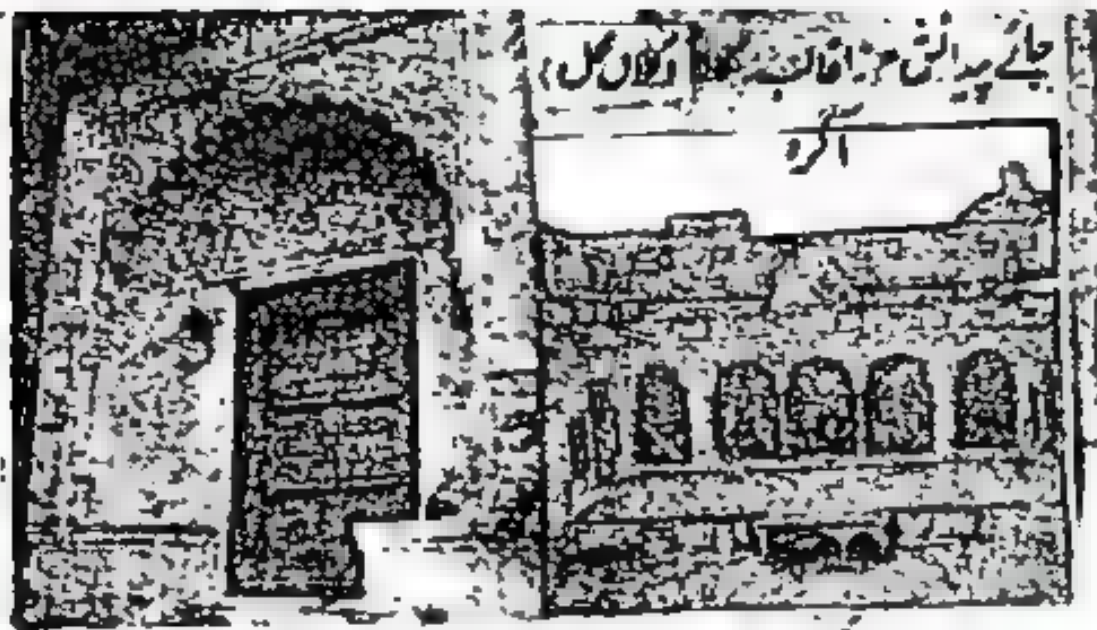
جب ان کے باپ کا انتقال ہو گیا۔ تو انھیں اپنے روزگار کی فکر ہوئی
اس لئے کہ یہاں سو کی جاگیر جاتی رہی وہ باپ کی زندگی تک کے لئے تھی لہذا انھیں
ملازمت کے لئے ادھر ادھر جانا پڑا پہلے وہ لکھنؤ میں جا کر لوہا آصف الدولہ
کے یہاں ملازم ہوئے پھر کچھ عرصہ کے بعد حیدر آباد میں نواب نظام علی خاں
کے یہاں ملازمت اختیار کر لی۔ یہاں وہ تین سو سواروں کے افسر رہے وہ
وہاں کسی برس تک رہے لیکن یہ ملازمت بھی حیدر آباد کے خانہ جنگی کے
جھگڑے میں جاتی رہی ۔

اس کے بعد انھوں نے الور کا قصد کیا اس وقت راجہ بختا ورسنگھ
حکمران تھے اتفاق سے ایک گڑھی کے رہنداروں نے راجہ سے بغاوت کی ۔
جو فوج باغیوں کو دبانے کے لئے بھیجی گئی اس میں مرزا عبداللہ بیگ خاں
بھی تھے ان کے گولی لگی اور ان کا انتقال ہو گیا اور راج گڑھ میں بدخون ہو گیا۔
مرزا غالب ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء مطابق
۸ رجب ۱۲۱۲ھ میں بمقام آگرہ پیدا

مرزا غالب کی ولادت

ہوئے۔ ان کا پورا نام اسد اللہ بیگ خاں تھا لیکن ان کو عام طور سے
مرزا نوشہ کے نام سے پکارا جاتا تھا ۔

مرزا غالب بھی پانچ برس کے بھی نہ ہوئے تھے کہ ان کے والد عبداللہ بیگ خاں کلاں میں
انتقال ہو گیا اور انھیں مرزا بیگ خاں نے بچوں کو اپنی سرپرستی میں لے لیا اور چونکہ ان کے
کوئی ادو نہ تھی اس لئے ان کی اپنے حقیقی بچوں کی طرح پرورش کی



مسجد کے زیر سایہ اک گھر بنایا ہے

مرزا نصر اللہ بیگ خاں | مرزا نصر اللہ بیگ خاں مرزا غالب

پہلے مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد (آگرہ) کے صوبہ دار تھے ۱۸۵۳ء میں جب لارڈ لیک نے چڑھائی کی تو مرزا نصر اللہ بیگ نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اور بغیر لڑے بھڑے شہر کو انگریزوں کے حوالہ کر دیا اس کا انگریزوں پر اچھا اثر ہوا پھر نواب احمد بخش صاحب نے بھی ان کی سفارش کی۔ غرضیکہ مرزا نصر اللہ بیگ کو انگریزی فوج میں چار سو سواروں کا رالہ بنا دیا گیا۔ اور سترہ سو روپے تنخواہ مقرر ہوئی۔ اس کے بعد مرزا صاحب نے سوٹنگ اور سونسا کے دو زرخیز پرگنے جو بھرت پور کے قریب تھے ریاست ملکر کے سپاہیوں سے چھین لئے اور ان پر قبضہ جالیا۔ جنرل لیک کو جب یہ معلوم ہوا تو انھوں نے یہ دونوں پرگنے بھی خوش ہو کر مرزا صاحب کو تاحیات خرچ کے لئے جاگیر میں دیدیئے اس واقعہ کے سال بھر بعد ایک لڑائی میں ہاتھی سے گر کر فوت ہو گئے مرزا غالب کی عمر اس وقت آٹھ برس کی تھی ان کے ساتھ ان کے چھوٹے بھائی مرزا پوسن بھی تھے۔

مرزا کے سرپرستوں نے لارڈ لیک سے سفارش کی اور بتایا کہ نصر اللہ بیگ نے گورنمنٹ کی زبردست خدمت انجام دی ہے لہذا اس کے صلے میں ان بچوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت کا انتظام کیا جائے لارڈ لیک نے ان کی سفارش پر کچھ نمیشن کا انتظام کر دیا اس کے علاوہ کچھ رقم انور سے

سے بھی بطور امداد ملتی تھی اس سے مرزا کا بچپن اور طفلی کا زمانہ نہایت عیش و آرام سے گزرا۔

جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا غالب کے نانا خواجہ
مرزا کی نضال غلام حسین کبیران تھے جو فوجی افسر تھے اور
 اگرہ کے رئیسوں میں سے تھے۔ ان کے پاس کافی جائیداد اور دولت
 تھی اس کا کچھ اندازہ مرزا غالب کے ایک خط سے ہوتا ہے جو انھوں
 نے منشی شیونزین کو لکھا تھا۔ فرماتے ہیں :-

”تم کو ہمارے خاندان اور اپنے خاندان کی آمیزش کا کیا حال معلوم
 ہے مجھ سے سنو تمہارے دادا کے والد عہد نجف خاں میں میرے نانا
 صاحب خواجہ غلام حسین خاں کے رفیق تھے جب میرے نانا نے
 نوکری ترک کی اور گھر بیٹھے۔ تو تمہارے پردادا نے بھی کمر کھول دیا
 اور پھر کہیں نوکری نہ کی یہ باتیں میرے ہوش سے پہلے کی ہیں مگر
 جب میں جوان ہوا تو میں نے دیکھا کہ منشی منشی دھر و منشی شیونزین
 کے دادا خان صاحب (خواجہ غلام حسین) کے ساتھ ہیں اور انھوں
 نے جو کھیت گاہوں میں اپنی جاگیر کا سرکار میں دعویٰ کیا تو منشی منشی
 اس امر کے منفرم ہیں وکالت اور مختاری کرتے ہیں اور وہ منشی
 منشی دھر، میرے ہم عمر تھے۔ شاید منشی منشی دھر مجھ سے ایک دو برس
 بڑے ہوں یا چھوٹے ہوں انہیں برس کی میری عمر ایسی ہی ان کی عمر
 باہم شطرنج اور اخلاط اور صحبت آدمی آدمی رات گزر جاتی تھی۔

چونکہ گھرانہ کا بہت بُرہ تھا اس واسطے جب چاہتے تھے چلے جاتے تھے بس ہمارے اور ان کے مکان میں پھنسیا رنڈی کا گھر اور ہمارے دو کمرے درمیان تھے ہماری بڑی حویلی وہ ہے جو اب سیٹھ لکھن چنڈ نے مول لے لی ہے اسی کے دروازے کی سنگین بارہ دری پر میری نشست تھی اور پاس ایک کھٹیا والی احمد سلیم شاہ کے تکیہ کے پاس دوسری حویلی اور کالے محل سے لگی ہوئی ایک اور حویلی اور اس سے آگے بڑھ کر ایک اور کمرہ گذریوں والا مشہور تھا۔ اور ایک کمرہ وہ کشمیرن والا کہلاتا تھا اس کمرے کے ایک کونے پر میں تنگ اُڑاتا تھا۔ اور راجہ بلورن سنگھ سے تنگ لڑا کرتے تھے۔ وہ اہل خاں ایک سہمی ہی تھا اسے دادا کا پیش دست رہتا تھا اور کڑوں کا کرایہ اگاہ کران کے پاس حبس کراتا تھا۔ ستو تو سہی تھا اور دادا بہت کچھ پیدا کر گیا ہے۔ علاقے مول نے تھے۔ اور زمیندارہ اپنا کر لیا تھا۔ دس بارہ ہزار روپے کی سرکاری مالگزار دی ادا کرتا تھا۔

اس کے علاوہ جیسا کہ اوپر مذکور ہو چکا ہے مرزا کے چچا نواب احمد بخش صاحب خاں کی ہمیشہ سے منسوب تھے جو خود بھی بہت دولت مند تھے۔ لہذا مرزا کا بچپن اور عہد طفلی بڑے سے ناز و نعم اور عیش کے ساتھ گزرا والد اور چچا کی وفات کے بعد مرزا اپنی تنہیال میں

مرزا کی تعلیم رہنے لگے بہت خوش حال لوگ تھے انہوں نے

اپنی حیثیت کے مطابق مرزا کی تعلیم و تربیت میں کوشش کی اس زمانے میں
 اگرچہ میں مولوی محمد معتمد صاحب ایک مشہور اور قابل استاد تھے۔ مرزا نے
 فارسی کی ابتدا کی تعلیم انھیں سے حاصل کی اس کے علاوہ ان کی والدہ بھی تعلیم
 یافتہ تھیں اور وہ بھی مرزا کی تعلیم کا پورا پورا خیال رکھتی تھیں۔

اسی زمانہ میں ایران کے مدینے والے ایک شخص ملا عبد الصمد سیاح
 اگرچہ وارد ہوئے یہ پہلے پارس تھے ان کا نام ہر مزد تھا لیکن اپنا
 آبائی مذہب چھوڑ کر مسلمان ہو گئے وہ فارسی کے زبردست عالم تھے
 اور عربی سے بھی واقف تھے۔ اتفاق سے ان کی مرزا سے ملاقات
 ہو گئی اس وقت مرزا کی عمر ۱۴ سال تھی۔ مرزا کی شاعری۔ ذہانت اور
 ذکاوت دیکھ کر وہ حیران رہ گئے مرزا کو بھی ان سے عقیدت ہو گئی اور
 انھیں اپنے گھر لائے اور دو سال تک ان سے فارسی پڑھی ملا عبد الصمد
 نے مرزا کو پاری مذہب اور عقائد کے متعلق تمام باتیں سمجھائیں مرزا کا
 حافظہ بلا کا تھا دو سال میں کافی فارسی پڑھ لی۔ بلکہ فارسی میں انھیں وہ مکہ
 ہو گیا جو اہل زبان ہی کا حصہ ہے غالب کی فارسی کی تحریروں سے
 یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ فارسی کے اصول و قواعد اور صرف و نحو سے اچھی
 طرح واقف تھے فارسی کی تمام تصانیف کتابیں اور اساتذہ کا کلام
 ان کی نظر سے گزر چکا تھا۔

مرزا نے دس گیارہ برس کی عمر سے شعر کہنا شروع
 کیا اور پچیس برس کی عمر تک تقریباً دو ہزار

شاعری کی ابتدا

اشعار کا دیوان تیار ہو گیا ان اشعار میں غالب نے بیتل اور اسپیرو
کی پیروی کی اس لئے ان کا ابتدائی کلام پچیدہ اور فارسی کی ترکیبوں
سے بھر پور ہے۔

میر تقی میر کی وفات کے وقت مرزا کی عمر ۱۳ سال کی تھی کسی نے
مرزا غالب کے اشعار انھیں سنائے تو انھوں نے فرمایا :-
"اگر اس بڑے کو کوئی کامل استاد مل گیا اور اس نے اس کو سیدھے
راستے پر ڈال دیا تو وہ لاجواب شاعر بن جائے گا ورنہ ہمسل

کے گا۔"

لیکن مرزا سبذ فیاض کے یہاں سے غیر معمولی ذہانت و اہلیت اور
شاعرانہ دماغ لے کر آئے تھے انھوں نے شاعری میں کسی کو استاد نہ بنایا۔
بلکہ اساتذہ متقدمین و مؤخرین کا اردو اور فارسی کا کلام دیکھ کر خود ہی
شاعری کرنے لگے۔

۱۹ اگست ۱۸۵۷ء کو تیرہ برس کی عمر میں مرزا کی شادی
نواب الہی بخش خاں معروف کی دختر امراؤ بیگم سے ہو گئی شادی
کے وقت امراؤ بیگم کی عمر ۱۱ سال تھی نواب الہی بخش معروف نواب احمد بخش
خاں بہادر والی فیروز پور جھڑکے چھوٹے بھائی تھے انھوں نے تمام
عمر گوشہ نشینی اور عبادت میں گزار دی یہ شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔
۱۸۵۷ء میں ان کا انتقال ہوا اور خواجہ نظام الدین اولیاء کے مقبرہ کے
قریب ہی دفن ہوئے۔

مرزا کا قیام دہلی | دہلی میں مرزا اپنے خاندان سے الگ تھلگ کرائے کے مکان میں آکر رہے اور دہلی کے مہذب اور تعلیم یافتہ حلقوں میں بہت جلد روشناس ہو گئے۔ اور ان کی بے مثال شاعری نے بہت جلد سب کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ یہاں ان کی ملاقات مولوی فضل حق خیر آبادی سے ہوئی۔ اور وہ دونوں ایک دوسرے کے گہرے دوست بن گئے۔ مولانا فضل صاحب شاعری کا بہت سخرا اور اعلیٰ مذاق رکھتے تھے انھوں نے غالب کو مشورہ دیا کہ اپنی موجودہ روش کو چھوڑ کر آسان روش اختیار کریں غالب کے دل میں ان کی بڑی عزت اور وقعت تھی۔ چنانچہ ان ہی کے مشورے سے انھوں نے اپنے دیوان سے بہت سے پچیدہ اور مشکل اشعار نکال دیئے۔ اور موجودہ دیوان مرتب کیا۔ جو اس وقت ہمارے ہاتھوں میں ہے یہی وجہ ہے کہ بعض غزلوں میں ایک یا دو شعری ملتے ہیں۔

پنشن کا قضیہ { مرزا کے چچا نصر اللہ بیگ کی وفات کے بعد۔ لارڈ ولکین نے ان کے عزیزوں کی پرورش کے لئے کچھ پنشن کا انتظام کرایا اور وہ اس طرح کہ نواب احمد بخش کو حکومت کی خدمات کے سلسلہ میں سرکار انگریزی کی طرف سے میوات میں فیروز پور جھک اور مصافحات ہوڈل تحصیل فیروز پور جھک میں تنجینہ اور پونا مانا وغیرہ کی جاگیر ملی تھی لیکن اس شرط پر کہ نواب احمد بخش انگریزی مہر کار کو

بچیس ہزار روپے سالانہ ادا کرتے رہیں گے لیکن نصر اللہ بیگ خاں کی وفات کے بعد ان کے پس ماندگان کی امداد کے لئے حکومت کی طرف سے حکم جاری ہوا کہ نواب احمد بخش خاں اپنی جاگیر کے سلسلہ میں جو بچیس ہزار روپے سالانہ دیتے ہیں وہ اس شرط پر سوا کئے جاتے ہیں کہ پندرہ ہزار تو وہ اپنے فوجی دستے کی غور پر و احت پر صرف کریں اور باقی دس ہزار وہ مرزا مرحوم کے خاندان کو بطور پیشینہ ادا کیا کریں۔

لیکن اس فیصلہ کے کچھ ہی عرصہ بعد کوشش کر کے نواب احمد بخش نے ایک دوسرا حکم حاصل کر لیا کہ مرزا نصر اللہ بیگ کے متعلقین کو بجائے دس ہزار کے صرف پانچ ہزار روپے تفصیل ذیل ادا کئے جائیں۔

- (۱) خواجہ حاجی دو ہزار روپے سالانہ۔
- (۲) مرزا نصر اللہ بیگ خاں کی والدہ اور تین بہنیں ڈیڑھ ہزار روپے سالانہ۔
- (۳) مرزا نوشہ اور مرزا یوسف برابر و درادگان مرزا نصر اللہ بیگ خاں مرحوم ڈیڑھ ہزار روپے سالانہ۔

اس حکم کے مطابق مرزا کو ساڑھے سات سو روپے سالانہ ایک عرصہ دراز تک ملنے رہے۔

خواجہ حاجی، نصر اللہ بیگ خاں کے متعلق یا پس ماندگان میں سے نہ تھے ان کو دو ہزار روپے سالانہ کی پیشین مرزا غالب کو بڑی شاق گزرتی تھی۔ اسے وہ اپنے خاندان کی حق تلفی شمار کرتے تھے اور سمجھتے تھے خواجہ حاجی کی وفات کے بعد یہ رقم ہمارے خاندان میں تقسیم کر دی جائے گی۔

لیکن ایسا نہ ہوا خواجہ حاجی کی وفات کے بعد ان کے دونوں بیٹوں شمس الدین خاں عرف خواجہ جان اور بدر الدین خاں عرف خواجہ زبانی (مترجم بوستان خیال) کے درمیان تقسیم کی گئی۔ مرزا نے اس تقسیم پر ناراضگی کا اظہار کیا اور لوگوں سے شکایت بھی کی لیکن کوئی نتیجہ نکلا۔

مرزا کو نواب احمد بخش کے دوسرے شقہ کا علم نہیں تھا وہ سمجھتے تھے کہ مسیٰ اللہ کے فیصلہ کے مطابق ان کے خاندان اور ان کو دس ہزار روپیہ سالانہ ملنا چاہئے اب تک جو پیش ان کو ملتی تھی اس کے متعلق اس لئے لب کشائی نہ کرتے تھے کہ نواب احمد بخش صاحب یوں بھی کچھ نہ کچھ دیتے رہتے تھے۔

نواب احمد بخش خاں صاحب نے ۱۸۲۲ء میں اپنی جائیداد کی تقسیم اس طرح کی کہ فیروز پور جھڑ کی ریاست اپنے بڑے

نواب احمد بخش کی اولاد میں
جائیداد کے لئے رکش مکش

بیٹے نواب شمس الدین احمد خاں کے نام کر دی۔ جو سیواقی بیوی بہو خانم سے پیدا ہوئے تھے اور لوہارو کی جاگیر کا وارث اپنی بیوی بیگم جان کے بیٹوں امین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں کو بنایا اور اپنی زندگی ہی میں اپنی جائیداد تقسیم کر کے خود گوشہ نشینی اختیار کر لی۔

نواب احمد بخش کی وفات کے بعد نواب شمس الدین احمد خاں نے یہ دعویٰ دائر کر دیا کہ لوہارو کا پرگنہ بھی میرے حوالہ کیا جائے اور بھائیوں

کی پیش منقرہ ہو اس لئے کہ وہ ابھی نابالغ ہیں اور انتظام کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ یہ مقدمہ دہلی کے انگریزی ریڈیٹنٹ کے پاس پہونچا اس نے یہ سفارش کی کہ پرگنہ لوہارو امین الدین خاں اور ضیاء الدین خاں ہی کے پاس رہے شمس الدین کو اس میں مداخلت کا کوئی حق نہ ہونا چاہیے جاگیر کے مصارف اور انتظامی اخراجات کے بعد جو کچھ بچے اس کا نصف حصہ ضیاء الدین احمد خاں کے نابالغی کے زمانے تک سرکاری خزانہ میں ان کے نام سے جمع ہوتا رہے جب وہ بالغ ہو جائیں تو وہ یہ ان کو دیدیا جائے۔ اور لوہارو کا پرگنہ دونوں بھائیوں میں برابر سے تقسیم کر دیا جائے۔ یہ فیصلہ تینوں کو سنا دیا گیا اور انھوں نے منظور کر لیا ریڈیٹنٹ نے اس فیصلہ کو منظوری کے لئے حکومت ہند کے پاس بھیج دیا حکومت ہند نے اس فیصلہ کو منظور کر لیا لیکن یہ تجویز بھی پیش کی کہ لوہارو کو تقسیم کرنا مناسب نہیں نابالغی کے زمانے تک جاگیر کا انتظام شمس الدین احمد خاں کی نگرانی میں دیدیا جائے آخر کار شمس الدین خاں کے بجد اصرار پر لوہارو کا انتظام ان کے حوالہ کر دیا گیا۔

مسئلہ میں ولیم فریزر دہلی کے ایجنٹ مقرر ہو کر آئے ان کے نواب احمد بخش صاحب سے دوستانہ تعلقات تھے امین الدین خاں اور ضیاء الدین خاں کی شکایت پر انھوں نے تجویز پیش کی کہ نواب احمد بخش کی تقسیم کے مطابق لوہارو ان کے دونوں بیٹوں کو ملنا چاہئے چنانچہ ان کے شکورہ سے دونوں بھائی کلکتے گئے تاکہ گورنر جنرل کے

یہاں اپنا مقدمہ پیش کر میں کلکتہ میں اُنھوں نے اپنے تمام حالات اعلیٰ
حکام کو سنائے چنانچہ فیصلہ ان کے حق میں ہوا اور لوہارو کی جائیداد کا وارث
ان دونوں بھائیوں کو تسلیم کیا گیا۔

اس فیصلہ سے نواب شمس الدین خاں کو بہت رنج ہوا قبضہ میں
آئی ہوئی جائیداد ہاتھ سے نکل گئی کہا جاتا ہے کہ اُنھوں نے یہ اسکیم
بنائی کہ کسی طرح فریزر کو قتل کر دیا جائے تاکہ ان کے سوتیلے بھائیوں
کا کوئی ہمدرد نہ رہے اس کام کو انجام دینے کے لئے اس نے اپنے
دو آدمیوں کریم خاں اور اینا کو مقرر کیا۔ کہ جب بھی موقعہ پائیں فریزر
کو قتل کر دیں۔

آخر ایک دن کریم خاں نے موقعہ پا کر گولی سے فریزر کو ہلاک کر دیا
اور خود بچکر نکل گیا ہر جگہ قاتل کی تلاش ہوئے مگر فریزر اور نواب شمس الدین
خاں کے تعلقات اچھے نہ تھے اور نواب صاحب فریزر کو اکثر ٹرے
الفاظ سے یاد کیا کرتے تھے تو بعض لوگوں کو یہ شک پیدا ہو گیا کہ ممکن ہے
کہ یہ فعل نواب صاحب کی سازش سے ہوا ہو۔

اس قتل کی تفتیش کے لئے حکومت نے جان لائس کو مقرر کیا۔
جان لائس کو مختلف شہادتوں اور ثبوتوں کی بنا پر یقین ہو گیا کہ نواب
شمس الدین خاں اس سازش میں ضرور شریک ہیں چنانچہ ان کے گھر
کی تلاشی لی گئی کچھ قابل اعتراض چیزیں برآمد ہوئیں ان کے ملازم و سائل
خاں کو گرفتار کر لیا گیا اور نواب صاحب کو پیغام بھیج کر دہلی طلب کیا گیا۔

نواب صاحب اپنے تعلقات کی بنا پر یہ سمجھتے تھے کہ ان کا بال
 بیکانہ ہوگا اگرچہ لوگوں نے یہ مشورہ دیا کہ نہ جائیں اور کہیں روپوش
 ہو جائیں لیکن نواب کی غیرت نے یہ بات گوارا نہ کی وہ ہتھیار لگائے
 نہایت شان کے ساتھ ریز پرنٹ کے پاس پہنچے یہاں ان کے
 لئے پہلے ہی سے انتظام کیا گیا تھا پہلے ان سے ہتھیار چھین لئے گئے
 پھر گرفتار کر کے ان کو نظر بند کر دیا گیا۔ کریم خاں اور اپنا بھی گرفتار
 ہو گئے مقدمہ چلا اور دونوں ملازمین نے سازش کا راز افشا کر دیا
 اور کریم خاں نے اپنا قصور تسلیم کر لیا شمس الدین بھی مجرم قرار دے دیے گئے
 پہلے کریم خاں کو پھانسی دی گئی پھر اکتوبر ۱۸۳۵ء میں شمشیری
 دروازہ کے باہر نواب شمس الدین احمد خاں کو بھی پھانسی دیدی گئی۔ اور
 ان کی میت کو قدم شریف میں دفن کیا گیا اور ان کی ریاست فیروز پور
 جھڑک حکومت نے ضبط کر لی۔

مرزا غالب کے خاندان کی پیش بھی نواب شمس الدین ہی کے
 ذمہ ہو گئی تھی نواب شمس الدین کی نیت اچھی نہیں تھی نہ مرزا کو اتنی
 قلیل پیش دینے میں بھی تساہل سے کام لیتے تھے آخر سال ۱۸۳۷ء میں
 پنشن بالکل بند کر دی گئی جو چار سال تک یعنی نواب شمس الدین کی گرفتاری
 تک بند رہی یہ زمانہ مرزا کے لئے بڑا صبر آزما تھا آمدنی کی کمی، اخراجات
 کی تشکی مضطرب، اور بھائی کی دیوانگی نے مرزا کو بہت پریشان کر دیا۔ پہلے
 نو اٹھوں نے نواب کی خدمت میں حاضر ہو کر معاملات کو سلجھانے کی کوشش

کی لیکن جب لو اب شمس الدین نے کوئی بات نہ مانی تو اُکھنوں نے فیصلہ کر لیا کہ ان کے اور ان کے خاندان والوں کے ساتھ جو بے انصافی کی گئی ہے اس سے اعلیٰ حکام کو مطلع کریں اور اپنے حق کے لئے جنگ کریں اور مرافعہ پیش کرنے کے لئے گورنر جنرل کی خدمت میں کلکتہ جاتیں ۔

سفر کلکتہ

مرزا غالب یہ سمجھتے تھے کہ جویشن انجیں فیروز پور جھبر کی طرف سے ملتی ہے وہ مفردہ رقم سے بہت ہی کم ہے ان کے خاندان والوں کو بجائے تین ہزار کے دس ہزار ملنے چاہئیں ۔

چنانچہ قانونی چارہ جوئی کر کے اور اپنا مرافعہ گورنر جنرل کے سامنے پیش کرنے کے لئے مرزا ۱۸۶۷ء میں کلکتہ روانہ ہوئے۔ اس وقت مرزا کی عمر تقریباً ۳۰ سال تھی لکھنؤ کے بعض احباب اور یہ معزز حضرات جنہوں نے مرزا کی شاعری کی شہرت سنی تھی چاہتے تھے کہ مرزا بھی لکھنؤ ضرور تشریف لائیں اس موقع کو غنیمت سمجھا اور براستہ کانپور لکھنؤ پہنچ گئے وہاں اہل لکھنؤ نے مرزا کی بہت اچھی طرح خاطر مدارات کی اس زمانے میں نصیر الدین حیدر لکھنؤ کے بادشاہ تھے اور روشن الدولہ امین السلطنت تھے نائب السلطنت نے مرزا کی شہرت سن کر ان کو ملاقات

کے لئے اپنے یہاں بلایا۔ لیکن مرزا نے دو شرطیں پیش کیں۔

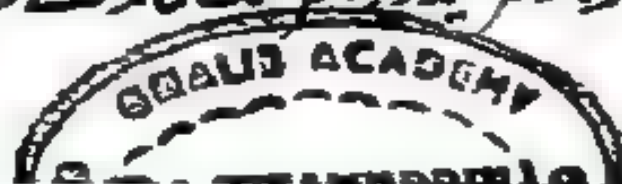
(۱) نائب السلطنت میرا استقبال کریں اور (۲) مجھے نذر دینے سے معاف کیا جائے چونکہ نائب السلطنت نے دونوں شرطیں نامنظور کیں اس لئے ملاقات نہ ہوئی۔

آخر کار ۲۲ جون ۱۸۵۷ء کو مرزا لکھنؤ سے روانہ ہو گئے ۱۹ اکتوبر ۱۸۵۷ء میں غازی الدین حیدر شاہ کا انتقال ہو گیا اور ان کی جگہ نصیر الدین حیدر بادشاہ ہوئے سات آٹھ سال بعد جب روشن الدولہ نائب السلطنت مقرر ہوئے تو منشی محمد حسن اور روشن الدولہ کی وساطت سے مرزا علی شاہ کا تعیندہ بادشاہ کے دربار میں بٹھا گیا اور بادشاہ کی طرف سے اس پر پانچ ہزار روپے انعام کا حکم ہوا بقول تاریخ تین ہزار تو روشن الدولہ کھل گئے دو ہزار منشی محمد حسن نے رکھ لئے۔ اور غالب کو ایک پیسہ بھی نہ ملا۔

مرزا لکھنؤ سے بنارس آئے یہ شہر انہیں بہت پسند آیا وہاں سے گھوڑے پر سوار ہو کر ٹپنہ اور مرشد آباد روانہ ہوئے۔ ۲ فروری ۱۸۵۷ء کو کلکتہ پہنچ گئے وہ شہر بازار میں ایک اچھا مکان دس روپے ماہوار کرائے پر بیکراش میں اقامت اختیار کی۔

کلکتہ میں مرزا کو غریبی کہ نواب، محمد بخش صاحب جن کی تیسیم کے خلاف مفد مرزا اثر کرنے کے لئے وہ کلکتہ آئے تھے۔ فوت ہو گئے انہوں نے جائیداد کا وارث نواب شمس الدین کو قرار دیا تھا اب مرزا کا تنازعہ انہیں سے تھا۔

آخر کار مرزا اینڈ روارٹس لنک کی مدد سے مرزا نے اپنا مراجعہ گورنر جنرل کی



کونسل میں پیش کیا۔ مرزا کے مطالبات یہ تھے۔

(۱) جو مقدار نمین سرکار نے مقرر کی ہے وہ ان کے خیال کے مطابق کم ہے وہ
امیندہ پوری ملا کرے۔

(۲) جس قدر کم نمین ملتی رہی ہے وہ ابتداء سے آج تک بیاست فیروز پور جھکر
سے دلائی جائے۔

(۳) کل نمین میں جو میرا حق قرار پائے وہ مجھے علیحدہ دیا جائے۔

(۴) یہ نمین فیروز پور خزانہ سرکار میں منتقل ہو جائے تاکہ انہیں فیروز پور سے
داناگنی پڑے۔

(۵) خطاب اور خلعت دیا جائے۔

گورنر جنرل کے دفتر سے یہ حکم ہوا کہ پہلے یہ درخواست ایجنٹ دہلی کے
پاس جانا چاہیے وہ کوئی سفارتیں کریں گے تو اس پر غور کیا جائے گا۔

چنانچہ مرزا خود کلکتہ میں رک گئے اور اپنے وکیل ہیرالال کی معرفت سر
ایڈورڈ کول برگ ایجنٹ دہلی کی خدمت میں درخواست بھیجی کہ کول برگ مرزا کے حق
رپورٹ کی اس انشاء میں کول برگ کا انتقال ہو گیا۔ اور نئے سرے سے تفتیش
شروع ہوئی۔

اب کلکتہ کے قیام سے کوئی قاعدہ نہ تھا اس لئے مرزا ۲۹ نومبر ۱۸۶۹ء
کو کلکتہ سے دہلی آ گئے وہاں لایسنس کرنے کے لئے ایجنٹ فرانسس ہاس سے مدد چاہی لیکن
فرانسس کے نواب شمس الدین سے دوستانہ تعلقات تھے انہوں نے جو رپورٹ
پیش کی وہ شمس الدین کے حق میں تھی ابھی یہ رپورٹ کلکتہ پہنچی تھی کہ

اسٹرنگ مرگیا اور کلکتہ میں مرزا کی سفارش کرنے والا کوئی نہ رہا۔
 آخر کار رارڈ ولیم بیننگ نے مرزا کے خلاف فیصلہ دیا البتہ ان کی درخواست
 نمبر ۳ نمبر ۴ منظور کرتی تھیں پانچویں بھی نامعلوم ہو گئی۔ لیکن جب کبھی دہلی میں
 وائسرائے بالقیٹنٹ بہادر کا دربار ہوتا تو ان کو بھی مثل دیگر رؤساء کے
 بلایا جاتا اور سات پارچے کا خلعت مع جیفہ سڑیچہ دیا لائے مرزا واپس مرزا کو
 دیا جاتا۔

کلکتہ کا قیام | شہر کلکتہ مرزا کو بہت پسند آیا اپنے دوستوں کو جو خط
 لکھے ان میں کلکتہ کی بہت تعریف تھی ہے مرزا دو سال
 تک کلکتہ میں رہے یہاں کی آب و ہوا انھیں بہت راس آئی۔ اسی دوران
 میں اکثر ادیب اور اہل قلم مرزا کے دوست بن گئے۔
 نواب اکبر علی طباطبائی جو امام باڑہ ہو گئی کے متولی تھے مرزا نے
 ایک خط میں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ”ایسا عالی پایہ اور صاحبِ دل
 امیر بنگال میں نہ ہوگا۔“

مولوی سراج الدین احمد قصبہ موہان کے رہنے والے تھے جو بغرض
 کا دیوار کلکتہ میں قیام پذیر تھے ان کے مرزا سے بہت گہرے تعلقات ہو گئے
 تھے ان کے متعلق لکھتے ہیں۔

ستتر ہزار آدمی نظر سے گزرے ہوں گے دو غلیص صادق الاولاد
 دیکھے ایک مولوی سراج الدین اور دوسرے منشی غلام غوث خاں۔
 مرزا خاں نے اپنے منتخب اوروں کی اشعار کا مجموعہ جو ”گل رعنا“

کے نام سے مرتب کیا تھا وہ مولوی سراج ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔

کلکتہ کے ادبی ہنگامے | جس زمانے میں مرزا کلکتہ پہنچے برائے گریز
مہینہ کی پہلے اتوار کو ایسٹ انڈیا کمپنی

کے قائم کئے ہوئے مدرسہ کلکتہ میں ایک مشاعرہ ہوتا تھا جس میں فارسی
اور اردو کے شعرا اپنا کلام سناتے تھے غالب کے اعزاز میں ایک مشاعرہ
منعقد کیا گیا جس میں مرزا نے ایک فارسی کی غزل پڑھی اس پر بعض لوگوں نے
مرزا کے بعض الفاظ اور محاوروں پر اعتراض کئے۔ اور اپنے اعتراضات کے
جواز میں فارسی کے شہور شاعر قبیل کے اقوال سند پیش کئے مگر مرزا
ہندوستان کے فارسی شاعروں میں سوائے خسرو کے کسی کو نہیں مانتے
تھے انھوں نے ناک بھوں چڑھا کر کہا "بہن فرید آباد کے کھتری بچے کے
قول کو نہیں مانتا" اس پر معترضین میں اور زیادہ جوش پیدا ہوا اور مرزا پر
اعتراضوں کی بوچھاڑ ہونے لگی

مرزا نے اس مخالفت سے گھبرا کر فارسی میں ایک ثنوی یاد مخالف
کے نام سے لکھی جس میں پہلے تو اپنے مصائب اور پریشانیوں کا حال لکھا
اور لکھا کہ میں انصاف حاصل کرنے کے لئے اس شہر میں آیا ہوں مجھے چند
روز آرام سے رہنے دیجئے۔ اور وہاں لوازی کا حق ادا کیجئے مجھے کسی
سے بھی پرہاش نہیں ہے میں نے جو کچھ لکھا ہے اہل زبان کے الفاظ اور
محاوروں کو مد نظر رکھتے ہوئے لکھا ہے کہ اہل زبان اسی طرح لکھتے ہیں
اس ثنوی میں مرزا نے معترضین کے اعتراضات کا جواب بھی دیا لیکن

حاسدوں اور مفسدوں نے کوئی بات نہ سنی اور مرزا کی آخر تک مخالفت کرتے رہے۔

نواب امین الدین خاں سے تعلقاً | مقدمہ کی کوششیں ہیں نا کام ہونے کے بعد مرزا کی مافی

حالت بہت خراب ہو گئی اس مقدمہ کے اخراجات کے لئے اس اُمید پر لوگ قرض سے رہے تھے کہ انھیں اُمید تھی کہ مرزا ضرور مقدمہ جیت جائیں گے اور ان کی زمینیں واپس مل جائیں گی لیکن ایسا نہ ہوا۔ ایسے وقت میں ان کے دوستوں نے ان کی بڑی مدد کی جن میں ایک مولوی فضل حق صاحب تھے دوسرے نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ اور نواب امین الدین اور نواب خبیب الدین بھی گاہے گاہے مرزا کی مدد کرتے رہتے تھے اس لئے کہ نواب امین الدین کی مخالفت کی وجہ سے یہ لوگ آپس میں دوست بن گئے چنانچہ جب نواب امین الدین نواب شمس الدین کے خلاف مقدمہ دائر کرنے اور اپنا حق حاصل کرنے کے لئے کلکتہ گئے تو مرزا نے ان کی مدد کی اپنے کلکتہ کے دوستوں کو خطوط لکھے کہ وہ نواب صاحب کی ہر امکانی مدد کریں۔

اسی زمانے میں کسی نے فریئر کو گولی مار کر ہلاک کر دیا فریئر کے مرزا سے دوستانہ تعلقات تھے۔ ان کی تعریف میں مرزا نے ایک قصیدہ بھی لکھا تھا۔ فریئر کی موت کا مرزا صاحب کو بہت افسوس ہوا۔ لیکن حکومت ہند کو ثابت ہو گیا کہ فریئر کے قتل میں نواب شمس الدین کی سازش

تھی چنانچہ نواب شمس الدین کو پھانسی ہو گئی اور ان کی جائیداد ضبط ہو گئی اور
مرزا کی پیش جو فیروز پور سے آتی تھی باقاعدہ دہلی کلکٹری سے ملنی شروع
ہو گئی۔

مقدمہ کے بعد

مقدمہ کی ناکامی کے بعد مرزا نے مستقل طور پر دہلی میں رہائش اختیار
کی۔ ہر شاعری کی مغل میں مرزا عزت کے ساتھ بلائے جاتے اور ان کا
کلام نہایت ذوق شوق کے ساتھ سنا جاتا مرزا کو تھوڑا سا سکون ہوا تو
انہوں نے فارسی میں ایک کتاب (بیج آہنگ) لکھی جس میں مرزا کے
فارسی اشعار اور فارسی خطوط اور فارسی کے متفرق مضامین ہیں۔
یہ کتاب شمس الدین میں مرتب ہوئی ان میں فارسی خطوط سے مرزا کی
زندگی کے صحیح حالات معلوم ہوتے ہیں اور اس وقت ہندوستان میں جو بڑی
بڑی ہستیاں تھیں ان سے تعارف ہو جاتا ہے اس کے علاوہ مرزا نے
اردو خطوط نویسی میں جدت کر کے انقلاب پیدا کر دیا زمانہ قدیم میں خطوں
کی عبارت بہت پیچیدہ، متعقبات اور مختلف قسم کی صنعتوں سے بھر پور ہوتی
تھی مرزا نے اردو خطوط بھی لکھے جو سادگی میں فارسی خطوں سے بڑھ گئے
اتنی سادہ زبان میں خطوط لکھے کہ خطوط نویسی میں اردو کو انگریزی زبان
کے متر مقابل بنا دیا صرف خطوط نویسی کا عظیم الشان کارنامہ ہی مرزا کو ایک

عظیم المرتبت شخصیت منوانے کے لئے کافی ہے۔

ان کے تمام خطوط عود ہندی اور اُدوے کے معالی کتابوں میں چھپ چکے ہیں انہیں خطوط سے مرزا کے ذاتی اور خاندانی حالات عند شہداء کی تباہی ان کی عادات و اخلاق اور دوستوں سے برتاؤ کے سلسلہ میں صحیح معلومات ہوتی ہیں۔

ان کی جو کتابیں ان کے سامنے شائع ہوئی ہیں ان سے ان کی شہرت کو چار چاند لگ گئے اور مرزا بحیثیت ایک مصنف اور اعلیٰ پایہ کے شاعر کے تمام ہندوستان میں ریشناس ہو گئے۔ اور شعرو سخن میں مسلم الثبوت استاد تسلیم کئے جانے لگے۔

اسی شہرت سے متاثر ہو کر مسٹر ٹامس (سکرٹری گورنمنٹ آف انڈیا) ۱۸۷۲ء میں مرزا کو دلی کالج میں فارسی کی پروفیسری کے لئے بلایا۔ مرزا صاحب دستور ایک ہوا دار میں بیٹھ کر مسٹر ٹامس کے پاس پہنچے اور انتظار کرتے رہے کہ سکرٹری صاحب ان کا استقبال کرنے کے لئے تشریف لائیں۔ سکرٹری صاحب کو مرزا کے آنے کی خبر تو مل گئی لیکن وہ مرزا کو لینے نہیں آئے۔ جب دیر تک مرزا ان کے پاس نہیں آئے تو انھوں نے چیرا سی کو بھیج کر اندران کے پاس نہ آنے کا سبب دریافت کیا مرزا نے کہا پھینچا کہ چونکہ آپ مجھے لینے کے لئے باہر تشریف نہیں لائے۔ اس لئے میں بھی اندر نہیں گیا۔

اس بات کو سکر صاحب باہر تشریف لائے اور مرزا سے کہا کہ جب

آپ گورنری دہلی میں بحیثیت ایک رئیس کے تشریف لائیں گے تو ہم آپ کا استقبال کریں گے لیکن اس وقت آپ ملازمت کے لئے آئے ہیں اسی حالت میں آپ کا وہ استقبال نہیں ہو سکتا۔

مرزا نے کہا میں سرکاری ملازمت اس لئے کرنا چاہتا ہوں کہ خاندانی اعزاز بڑھے اس لئے نہیں کہ یہی سہی عزت بھی چلی جائے اس لئے ایسی ملازمت کو دور ہی سے سلام ہے۔

صاحب نے فرمایا ہم اس کالج کے قاعدے اور قانون سے مجبور ہیں اس پر مرزا نے جانے کی اجازت طلب کی اور واپس چلے آئے۔ اور اپنی نشان خودداری کو قائم رکھا۔

انگریزوں اور رئیسوں کی تعریف میں جو قصیدے لکھے ہیں وہ ان کی شاعری ہے منظم و مدحیہ ہیں شاعرانہ مبالغے ہیں جن کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں۔

قید کا واقعہ | مرزا کو شطرنج اور جو سر کھیلے کا بہت شوق تھا جب بھی انھیں شاعری سے فرصت ملتی دماغ

کی تفریح اور یکسوئی کے لئے وہ ان میں سے کوئی کھیل ضرور کھیلتے تھے کبھی کبھی بازی بد کر بھی کھیل لیتے تھے چنانچہ اسی جو سر کے کھیل کی بدولت ۱۸۶۴ء میں ایک ناخوش گوار واقعہ پیش آیا کسی حاسد نے پولیس کو خبر کر دی کہ مرزا جو کھیل رہے ہیں چنانچہ پولیس نے آکر ان کو گرفتار کر لیا۔ اور مرزا پر مقدمہ قائم ہو گیا۔

آخر کار مرزا کو چھ ماہ قید اور دو سو روپے جرمانے کی سزا ہوئی۔
یہ واقعہ مرزا پر بہت شاق گزرا وہ اس بات کو اپنے نیز اپنے خاندان
کے لئے بڑی بے عزتی کی بات سمجھتے تھے قید خانہ میں وہ بڑے
آرام سے رہے ان کو کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔

نصف میعاد گزرنے پر مجسٹریٹ کو خیال آیا کہ مرزا بے گناہ ہیں اس
لئے ان کو رہا کر دیا گیا۔ مرزا نے اس کو فارسی کے ایک خط میں اس طرح سے
ظاہر کیا ہے۔

”کو تو ال دشمن تھا اور مجسٹریٹ ناواقف۔ فتنہ لگھات میں تھا اور ستاد
گردش میں باوجودیکہ مجسٹریٹ کو تو ال کا حاکم ہے میرے باب میں وہ کیا
کا محکوم بن گیا اور میری قید کا حکم صادر کر دیا۔ سیشن جج باوجودیکہ
میرا دوست تھا۔ اور ہمیشہ مجھ سے دوستی اور مہربانی کے برتاؤ کرتا
تھا۔ اور اکثر صحبتوں میں بے کلفانہ ملتا تھا اس نے انعام اور
تفاضل اختیار کیا۔ صدد میں پہل کیا گیا۔ مگر کسی نے نہ سنا اور وہی حکم
بحال رہا پھر معلوم نہیں کیا باعث ہوا۔ کہ جب آدھی میعاد گزر گئی
تو مجسٹریٹ کو رحم آیا اور صدد میں میری رہائی کی رپورٹ کی اور وہاں
سے حکم رہائی آگیا۔ حکام صدد نے ایسی رپورٹ بھیجے پر اس کی
تعریف کی سنا ہے کہ عدل حاکموں نے مجسٹریٹ کو بہت نفریں کی
اور میری خاکساری اور آزدہ حالی سے اس کو مطلع کیا۔“

اس زمانے میں جبکہ رشتہ داروں۔ عزیزوں اور دوستوں

سب نے مرزا ساتھ چھوڑ دیا تھا صرف نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ ہی ایسے شخص تھے جو آخر وقت تک مرزا کے مقدمہ کی پیروی کرتے رہے۔ ان سے ملنے کے لئے قید خانہ جایا کئے اور ان کی مالی مدد کرتے رہے۔

شاہی ملازمت

دہائی کے کچھ عرصہ کے بعد مرزا صاحب نے کالے خاں مرشد بہادر شاہ ظفر کی سفارش سے شاہی دربار میں باریابی حاصل کر لی مرزا صاحب نے بادشاہ کی تعریف میں کئی قصیدے لکھے تھے اور انھیں انعام و اکرام مل جاتا تھا۔

اسی اثناء میں بہادر شاہ کو تیموری خاندان کی تاریخ لکھوانے کا خیال پیدا ہوا مرزا کی فارسی مستند سمجھی جاتی تھی یہ کام ان کے سپرد ہوا۔ مرزا بحکم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ کے خطاب سے مرزا فرما کر حسب دستور چتر پارچے کا خلعت اور تین جواہر عطا فرمائے گئے اور مرزا کو شہزادہ میں درباری مورخ مقرر کیا۔

مرزا صاحب نے اس تاریخ کا نام "پرتوستان" رکھا پہلے حصہ کا نام جس میں شاہ تیمور سے لیکر ہمایوں تک حالات درج ہیں "مہر خیر و نہ" ہے۔

شاہان تیموری کی تاریخ کا پہلا حصہ مہر خیر و نہ ۱۵۵۵ء میں چھپ کر شائع ہوا اور دوسرا حصہ "ماہ نیم ماہ" ابھی چھپنے بھی نہ پایا تھا کہ غدر کا واقعہ رونما ہو گیا اور اس طرح یہ تاریخ نامکمل رہ گئی۔

مرزا کی مالی حالت اب قدرے اچھی ہو گئی تھی دربار کے تعلق کی وجہ سے شہر میں ہر جگہ ان کی عزت ہوتی تھی۔ ادھر ان کی شاعری کی دھوم مچتی

بڑے بڑے شاعروں میں بلائے جاتے تھے اور لوگ ان کے کلام کو آنکھوں میں جگہ دیتے تھے۔ اس زمانے میں ذوق اور مومن بھی شاہی دربار میں جاتے تھے ذوق بادشاہ کے استاد سمجھے لیکن پھر بھی ان تینوں بالکمال شاعروں میں چشمک رہتی تھی۔

۱۸۵۲ء میں مومن کا انتقال ہو گیا اور اس کے دو سال بعد ۱۸۵۴ء میں ذوق راہی ملک بقا ہو گئے ان شاعروں کی وفات کے بعد بادشاہ کے اشعار کی اصلاح ان کے سپرد ہو گئی

عہد ۱۸۵۷ء

اپریل ۱۸۵۷ء تک تمام ملک انگریزوں کے قبضہ میں آ گیا تھا صرف دہلی کا قلعہ باقی تھا جہاں خاندان مغلیہ کے آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر کی حکومت تھی لیکن قلعہ سے باہر تمام دہلی میں انگریزی سرکار کا حکم چلتا تھا لیکن ہندوستان کے تمام لوگ انگریزوں کی چیرہ دستیوں اور برتاؤ سے خوش نہ تھے بعض تو ان سے مصافحہ کرنے کے بعد اپنے ہاتھ دھو دیتے تھے۔

انگریزوں نے سکولوں میں یامبل کی تعلیم لازمی کر دی تھی اور مشنریاں قائم کر دی تھیں جو لوگوں کو عیسائی بنانی بھیتیں ان حالات کے ماتحت ان کے خلاف لوگوں کی نفرت بڑھتی جاتی تھی۔

سب سے پہلے دسی سپاہیوں نے میسر ٹھہ میں اپنے افسروں کے حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ جب ان پر زیادہ سختی کی گئی تو انھوں نے بغاوت کر دی اور اپنے افسروں کو قتل کر دیا۔ اور راستہ میں قتل و غارت کرتے ہوئے دہلی پہنچے۔ بخت خاں ایک مشہور فوجی افسران کی رہنمائی کر رہا تھا۔ بہادر شاہ اس واقعہ سے بہت متاثر ہوئے ایک دن انھوں نے اپنے بعض مصاحبوں سے مخاطب ہو کر فرمایا۔

”تم جانتے ہو کہ آج کل جو سامان ہو رہا ہے اس کا انجام کیا ہونے والا ہے ہمید خاں جمہدار نے عرض کی حضور ڈیڑھ سو سال کے بعد حضور کا اقبال یاور ہوا ہے گئی ہوئی سلطنت پھر واپس آتی ہے۔ بادشاہ سلامت نے فرمایا :-

”تم لوگ نہیں جانتے جو کچھ میں جانتا ہوں مجھ سے سن لو کہ میرے بگڑنے کا کوئی سامان نہ تھا یعنی بنا، فساد، مال و دولت، خزانہ، ملک سلطنت وغیرہ ہو کرتے ہیں میرے پاس ان میں سے کوئی چیز موجود نہ تھی میں تو پہلے ہی فقیر بیٹھا ہوا تھا مجھ کو کسی سے کیا خصوصیت میں تو ایک گوشہ ایزدی میں فقیر کا تکیہ بنائے ہوئے چار صد توں کو ہمراہ لئے بیٹھا ڈٹی کھاتا ہوں میرے بگڑنے کا کوئی سامان نہ تھا اب جو منجانب اللہ میرے سے آگ لگی اور دلی آ کر بھڑکی فتنہ برپا ہوا فلک غدار اور زمانہ مانہنجا کو میرے گھر کی تباہی منکود ہے آج تک سلاطین چٹائی کا نام چلا آتا تھا ادب آئندہ کو نام و نشان یک قلم نابود ہو جائے گا اس کے بعد انگریز

لوگ میرا اور میری اولاد کا سر کاٹ کر قلعہ کے کنگرے پر چڑھا دیں گے۔ اللہ
تم لوگوں میں سے کسی کو باقی نہ چھوڑیں گے اگر کوئی باقی رہ جائے گا تو میرا
قول یاد رکھیے گا۔

۱۱ مئی ۱۹۵۷ء کو شہر دہلی پر باغیوں کا قبضہ ہو گیا باغیوں کے سردار
بخت خاں نے بہادر شاہ سے درخواست کی کہ وہ شاہ ہند ہونے کا اعلان
کر دیں ہم انگریزوں کو ہندوستان سے نکال دیں گے اور مغلیہ خاندان
کی حکومت قائم کر دیں گے۔ لیکن بہادر شاہ کو اپنا انجام معلوم تھا اس
لئے انہوں نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا آخر کار باغی شہر میں پھیل گئے اور
قتل و غارت کا بازار گرم ہو گیا جو انگریز جہاں نظر آیا مار دیا گیا۔
آخر کار انگریزوں نے پنجاب سے دسی سپاہیوں کی تازہ دم فوج منسکائی
اور اجیت گڑھ کو سو رچ بنا کر شہر پر گولہ باری شروع کر دی۔ باغیوں کی فوج
منظم نہ تھی نہ ان کے پاس کافی اسلحہ تھے لہذا ان کو شکست ہو گئی۔ ان کا سردار
کسی نامعلوم جگہ فرار ہو گیا اور ۱۴ ستمبر ۱۹۵۷ء کو شہر پھر انگریزوں کے قبضے میں
آ گیا۔

مرزا غالب نے لکھا ہے کہ فتح مند فوج جب شہر میں داخل ہوئی تو لوگ
بے احتیاطی قتل ہونے لگے معزز صاحب نے گھر کے دروازے بند کر لئے۔
انگریزوں نے غضب کی حالت میں تصور و بے تصور سب کو مارنا شروع کر دیا۔
اکثر گھروں میں آگ لگا دی گئی ہزاروں آدمی دلی چھوڑ کر بھاگ گئے شہر کی
تمام رکائیں بن بھینس گندم فروش دھوبی۔ حجام خاکروب سب غائب

ہو گئے۔ اکثر لوگ فاقہ سے زندگی بسر کر رہے تھے میٹھا پانی زور زور تک نہیں ملتا تھا۔ ایک دن اتفاق سے بارش ہو گئی تو لوگوں نے گھروں کے اندر کچھ پانی پینے کے لئے جمع کر لیا۔

جیسے ہی بغاوت رونما ہوئی۔ مرزا نے اپنے گھر کا دروازہ بند کر لیا اور جب تک اس نہ ہو گیا اپنے گھر سے باہر نہ نکلے جو دیکھتے تھے یا سنتے تھے لکھ لیتے تھے چنانچہ غدر سے متعلق تمام مضامین ان کی کتاب دستیاب و درج ہیں یہ کتاب فارسی زبان میں ہے اور چھپ چکی ہے۔

ان دنوں مرزا کو اپنے چھوٹے بھائی مرزا یوسف بیگ کا ہر وقت خیال رہتا تھا اس لئے کہ وہ بیس سال سے دیوانے تھے۔ ان کی بیگم مرزا یوسف کو ایک عمر رسیدہ شخص اور خادم کے پردہ کر کے بچوں کو لیکر جے پور کو چلی گئیں مرزا یوسف بیگ مرزا غالب کے مکان سے کافی فاصلہ پر رہتے تھے اسی اثنا میں اس سن رسیدہ شخص نے مرزا غالب کو اطلاع دی کہ تین دن شدتِ بخار میں مبتلا ہو کر مرزا یوسف کا انتقال ہو گیا ہے اس خبر کو سن کر مرزا کو انتہائی رنج ہوا۔ اس وقت کفن کے لئے کپڑا ملنا ناممکن تھا۔ اس کے علاوہ میت کو قبرستان لے جانا تو بہت ہی مشکل تھا۔ کیونکہ چاروں طرف پہرہ لگا ہوا تھا۔ مرزا کے مہسایوں نے پٹیا لہ کی فوج کے ایک سپاہی کے ہمراہ مرزا غالب کے گھر سے دو چادریں لیں اور مرزا یوسف کے مکان پر جسا کر پہلے انھیں غسل دیا۔ پھر انھیں دونوں چادروں میں کھنکھ کر گھر کے نزدیک مسجد تہو ر خاں کے صحن میں دفن کیا۔

چند دن کے بعد کچھ گورے مرزا غالب کے مکان میں بھی گھس گئے
 انہوں نے گھر کی کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا۔ مرزا غالب اور ان کے لوگوں
 اور چند مہایوں کو پکڑ کر کرل براؤن کے پاس لے گئے۔ جو مرزا کے مکان
 کے قریب حاجی قطب الدین کے مکان میں موجود تھے۔

کرل نے مرزا کی عجیب و غریب ہیئت دیکھ کر پوچھا "اول تم مسلمان
 ہو مرزا نے جواب دیا: "آدھا" کرل نے پھر پوچھا: "یہ آدھا مسلمان
 کیا ہوتا ہے؟" مرزا نے جواب دیا کہ: "... شراب پیتا ہوں، شور نہیں کھاتا"
 مرزا کا یہ جواب سن کر کرل صاحب بہت سنسنے لگی اور باتیں دریافت
 کیں۔ اور نہایت عزت اور مہربانی کے ساتھ مرزا اور ان کے ساتھیوں کو
 گھر جانے کی اجازت دے دی۔

مرزا کے دوستوں پر مصیبت | شہر کے تمام معزز لوگوں سے

مرزا کے تعلقات تھے ان میں سے کچھ تو مرزا کے گہرے دوستوں میں تھے جو تکلیف کے وقت مرزا
 کی مدد کرتے تھے کچھ ایسے شاعر اور اہل قلم تھے جو مرزا کی دوستی پر
 فخر کرتے تھے غدر کے زمانے میں انگریزی حکومت نے ان کے اکثر دوستوں
 پر بغاوت کا الزم لگایا۔ اور ان پر مقدمہ چلا کر ان کو کسی نہ کسی مصیبت
 میں پھنسا دیا ان میں سے بعض خاص دوست یہ تھے۔

(۱) **نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ**۔ جو فارسی ادباء و دو کے نہایت اچھے
 شاعر تھے اور مرزا کی بڑی مدد کرتے تھے۔ جب قمار بازی کے الزم

میں مرزا پر مقدمہ چلا اور اوران کے عزیزوں اور رشتہ داروں نے بھی ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ تو یہی نواب شیفتہ مجھے چھبوں نے آخر دم تک مرزا کا ساتھ دیا۔ دہلی کے بڑے بڑے حکام سے ملے اور مرزا کے الزام کو چھوٹا کر کے رہائی کی کوشش کی اور مقدمہ میں خفیہ مصارف ہوئے سب اپنے پاس سے ادا کئے۔ مرزایابی کے بعد وہ قید خانہ میں برابر ملتے رہے۔ اور خود ایک جگہ لکھتے ہیں۔

”مجھے مرزا کے زہد و اتقا کی وجہ سے ان سے عقیدت نہ تھی جسے کا الزام آج عائد ہوا۔ مگر شراب پینا تو مجھے ہمیشہ سے معلوم ہے پھر اس الزام میں گرفتاری کی وجہ سے میری عقیدت کیوں متزلزل ہو“

نواب شیفتہ کو بغاوت کے جرم میں سات سال کی سزا ہوئی ان کی گرفتاری کے بعد مرزا صاحب نے بھی ان کی رہائی کے لئے بہت کوشش کی۔ جب اپیل کے بعد وہ رہا ہوئے تو مرزا صاحب سب سے پہلے ان سے ملاقات کرنے میں کٹھ پھوٹے۔

(۲) مولوی فضل حق خیر آبادی۔ مرزا کے بڑے گہرے دوست تھے انھیں کے مشورے سے مرزا نے اپنے دیوان میں سے مشکل اور پیچیدہ اشعار نکال کر موجودہ دیوان مرتب کیا تھا۔ ان ہی کی وساطت سے نواب یوسف علی خاں والی رام پور سے تعلقات ہو گئے بغاوت کے جرم میں وہ جلاوطن کر دیئے۔ اور ہندوستان سے باہر ہی وفات پائی۔

(۲) مفتی صدر الدین آندردہ فارسی کے اعلیٰ شاعر تھے مرزا کے بڑے دوست تھے اور صدر الصدور کے عہد سے پرفاضل تھے۔ گرفتار کر لئے گئے ایک عرصہ تک جیل میں رہے بڑی مشکل سے جان بچی پھر بھی بہت سی جائیداد ضبط ہو گئی۔ اتنی رہی کہ مشکل سے گزار ہو سکے۔

شہر کے بڑے بڑے رئیس جن پر ذرا سا بھی شبہ ہوا کہ انھوں نے باغیوں کی مدد کی ہے یا انگریزی فوج سے مقابلہ کیا ہے پکڑ لئے گئے جیسے عبدالرحمن والی جھو احمد علی خاں والی فرخ نگر بہادر جنگ خاں والی بہادر گڑھ۔ نامہ سنگھ والی بلجہ گڑھ وغیرہ ایک ایک کر کے ان کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ ۱۸ سنہ کو قلعہ پر بھی قبضہ کر لیا گیا۔ شہزادوں کو گرفتار کر کے گولی سے مار دیا گیا اور بادشاہ پر بغاوت کا الزام لگا کر مقدمہ قائم کر دیا گیا اور کچھ عرصہ بعد مجرم قرار دے کر زندگیاں بھیج دی گئیں۔

مسلمانوں پر خاص طور پر سختی کی جا رہی تھی۔ کسی نے یہ اطلاع دی کہ شریف خانی حکیموں کا مکان ٹیمپلہ کے سپاہیوں کی حفاظت کی وجہ سے مسلمانوں کی پناہ گاہ بن گیا ہے تو حکیم محمود خاں صاحب کو موساٹھ آدمیوں کے گرفتار کر لیا گیا۔

مرزا شہر کی دیرانی کا حال ان الفاظ میں لکھتے ہیں :-
اپنے مکان میں بیٹھا ہوا ہوں۔ دروازے سے باہر نہیں نکل سکتا۔
سوار ہونا اعدا کہیں جانا تو بڑی بات ہے یہاں کہ کوئی میرے پاس
مے شہر میں ہے کون جو میرے پاس آئے۔ گھر کے گھر بے چارے پڑے

ہیں مجرم سیاست پائے جاتے ہیں جزیلی بند و بست (ماڈل لا) یا زہم می سے آج تک یعنی شنبہ پنجم دسمبر ۱۹۷۵ء تک بدستور ہے کچھ ٹیک و بد کا حال مجھ کو نہیں معلوم بلکہ ہونذا ایسے امور کی طرف حکام کی توجہ ہی نہیں دیکھے انجام کیا ہوتا ہے۔
دستبنو میں لکھتے ہیں :-

واللہ ڈھونڈنے میں مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا کیا امیر کیا غریب کیا اہل حرفہ کچھ ہیں تو باہر کے ہیں۔
میر مہدی مجروح کو ایک خط میں لکھتے ہیں :-

درد اس شہر میں ایک نیا حکم ہوتا ہے کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا ہوتا ہے میرٹھ سے آکر دیکھا کہ یہاں بڑی شدت ہے اور حالت یہ ہے کہ گوروں کی پاسانی پر قناعت نہیں لاہوری دروازہ کا تھانہ دار موٹھے بچھا کر مرگ پر مٹھتا ہے جو باہر سے گولے کی آنکھ بچا کر آجاتا ہے اس کو پکڑ کر حوالات میں بھیج دیتا ہے حاکم کے ہاں سے پانچ پانچ بیہ لگتے ہیں یا دور دور پر جرمانا لیا جاتا ہے آٹھ دن قید رہتا ہے اس کے علاوہ سب تھانوں پر حکم ہے کہ دریا کر کو کون بے ٹکٹ مقیم ہے تھانوں میں نقشے مرتب ہونے لگے ہیں۔

یہاں کا حیدر امیرے پاس بھی آیا میں نے کہا بھائی تو مجھے ہر نقشے میں نہ رکھ میری کیفیت کی عبادت الگ فکر عبادت یہ ہے کہ

اس اللہ خاں نیشن دار شدہ سے حکیم پٹیا لے دے کی حویلی میں رہتا ہے نہ کاریوں کے وقت میں کہیں گیا نہ گوروں کے رہانے میں نکلا۔ اور نہ نکالا گیا۔ کرنل براؤن صاحب بہادر کے زبانی حکم پر اس کی اقامت کا دار و مدار ہے اب تک کسی حاکم نے وہ حکم نہیں بدلا اب حاکم وقت کو اختیار ہے پرسوں یہ عبارت جامعہ دار نے محکمہ کے نقشے کے ساتھ کہ تواری میں بھیج دی ہے کل سے یہ حکم نکلا ہے کہ یہ لوگ شہر سے باہر مکان و دوکان کیوں بناتے ہیں انھیں ڈھا دو اور آئندہ کو ممانعت کا حکم سنا دو اور یہ بھی مشہور ہے کہ پانچ ہزار ٹکٹ چھاپے گئے ہیں جو مسلمان شہر میں اقامت چاہے بقدر مقدور نذرانہ دے اس کا اندازہ قرار دینا حاکم کی رائے پر ہے نہ یہ دے اور ٹکٹ لے۔ آپ شہر میں آباد ہو جائے آج تک یہ صورت ہے دیکھئے شہر کے بننے کی کون مہورت ہے جو رہتے ہیں اخراج کئے جاتے ہیں یا جو باہر پڑے ہوئے ہیں وہ شہر میں آتے ہیں۔

غدر کے بعد دہلی کا نقشہ ایک اور خط میں میر مہدی کو لکھتے ہیں۔

پرسوں میں سوار ہو کر کنوٹ کا حال دریافت کرنے گیا تھا مسجد جامع سے راج گھاٹ تک بلا مبالغہ ایک صحرائے لخت و رق ہے انیسویں کے ڈھیر جو پڑے ہیں وہ اگر اٹھ جائیں تو ہوا

عالم ہو جائے یا دکر وک مرزا گوہر کے ہانچے کے اس جانب کئی بانس
 ٹیشب تھا اب وہ ہانچے کے صحن کے برابر ہو گیا۔ یہاں تک راج
 گھاٹ کا دروازہ بند ہو گیا فکیل کے کنگو سے کھلے رہتے ہیں
 باقی سب اس گیا ہے کشمیری دروازے کا حال تم دیکھ گئے ہو
 اب آہنی ٹرک ریل کی پٹری کے واسطے کلکتہ دروازہ سے
 کاٹی دروازے تک میدان ہو گیا پنجاب کٹرہ۔ دھوبی داڑہ راجی
 گنج۔ سادات خاں کا کٹرہ۔ جرنیل بی بی کی حویلی راجی داس گو دام
 والے کے مکانات صاحب رام کا باغ و حویلی ان میں سے کسی کا
 پتہ نہیں ملتا فقہ مختصر شہر صحرا ہو گیا ہے۔ اور اب جو کو تیں جاتے
 رہے اور پانی کو ہر نایاب ہو گیا۔ تو یہ صحرا صحرا سے گرہلا ہو جائیگا
 اللہ ولی ولے سچ تک یہاں کی زبان کو اچھا سمجھتے ہیں۔ واہ نے
 حسن اعتقاد بندہ خدا دروازہ نہ رہا اردو کہاں دلی کہاں
 واللہ اب شہر نہیں کہیں ہے چھاؤنی ہے نہ قلعہ ہے۔ نہ شہر
 نہ بازار نہ نہر۔

فتح دہلی کے کوئی پانچ سال بعد ۱۶ دسمبر ۱۸۵۷ء کے ایک خط میں
 لکھتے ہیں۔

جو یائے حال دہلی والو سلام لو۔ مسجد جامع داگڑا اشت ہو گئی
 چتلی قبر کی طرف پڑھیوں پر کہا بیوں نے دوکانیں بنالیں۔ انڈیا
 مرغی۔ کبوتر بکنے لگے دس آدمی ہنتم ٹھہرے۔ مرزا الہی بخش۔

مولوی صدر الدین تفضل حسین خاں یہ تین۔ سات اور ۷ رقمبر۔
۱۳ جمادی الثانی۔ سال حال جمعہ کے دن ابوالمنظف مہراج الدین
بہادر شاہ قید فرنگ جہم سے رہا ہوئے۔

مرزا کی آمدنی کے دو ہی ذریعہ تھے۔ قلعہ معانی سے تنخواہ اور سرکاری
پیش خدمت کی وجہ سے دونوں جگہ کی آمدنی بند ہو گئی۔ شہر کے معزز زاد و غماند
گرفتار ہو گئے تھے مرزا کی گردان و نوں اس زمانے میں بڑی مشکل سے
ہوتی تھی لوٹا کے خوف سے سبک مرزا نے تمام زیور اور لوگوں کی طمع
نصیر الدین عرف کالے صاحب کے یہاں ان کے مکان کے صحن میں
دبا دیا لیکن فوجی سپاہی کھود کر نکال کر لے گئے۔
اس غلطی اور سنگدستی کے زمانے میں بھی برابر غریبوں کی مدد کرتے
رہے اور اپنے کسی ملازم کو علیحدہ نہیں کیا۔

۱۸۵۷ء میں جب نواب یوسف
خدر کے بعد دس سال کا زمانہ | علی خاں رام پور میں تخت نشین
ہوئے۔ تو مرزا نے قطعہ تاتخ جلوس لکھ کر بھیجا۔ دربار رام پور سے اس کا
کوئی جواب نہ آیا۔

مولانا فضل حق خیر آبادی رام پور میں فردکش تھے جب نواب صاحب
سے ملے تو مرزا نے سچ علمی اور شعر و شاعری کا ذکر ضرور کرتے اور نواب صاحب
کو ان کے چیدہ اشعار بھی سناتے نواب صاحب خود بھی بڑے علم و دست

تھے۔ آخر کار وہ بھی آہستہ آہستہ مرزا کے مقتقد ہو گئے۔ چنانچہ
مرزا نے ایک خط میں بے خبر کو لکھا :-

”نواب یوسف علی خاں والی رام پور میرے آشنائے قدیم ہیں
اس سال ششہ او میں میرے شاگرد ہوئے اور ناظم تخلص ان کو دیدیا
گیا ہیں پچیس غز لیس اردو کی بھیج دی ہیں۔ اور میں نے انھیں صلاح
کر کے بھیج دیا ہے گاہ گاہ ادھر سے کچھ روپیہ آ جاتا ہے۔“

ششہ ۱۸۵۵ء سے ششہ ۱۸۵۶ء تک غدر کی پریشانی کے باعث دربار
رام پور سے کوئی خط و کتابت نہ ہو سکی لیکن نواب صاحب کو اپنے استاد
مرزا غاکب کی پریشانی اور تنگدستی کا حال معلوم ہوا تو انھوں نے سو روپیہ
ماہوار تاحیات ان کی تنخواہ مقرر کر دی اور مرزا صاحب کو نواب صاحب
کی طرف سے یہ اطلاع ملی کہ :-

”بظہر آپ کی زیر بارید کے اس مہینہ سے سو روپیہ ماہوار مقرر کیا
گیا اور دفتر میں آپ کا نام مندرج کیا گیا ہر مہینہ تنخواہ مقررہ
پہنچے گی۔“

غدر کے بعد جب ہر طرف امن و امان ہو گیا تو نواب رام پور نے
مرزا کو رامپور آنے کی دعوت دی اور متواتر کئی محبت آمیز خطوط لکھے
چونکہ مرزا کی پیش اور دربار وغیرہ بند ہو گئے تھے اور وہ پیش کی اجراء کی
کوششوں میں لگے ہوئے تھے اس لئے کوئی نہ کوئی غدر لکھ کر بھیج دیتے
تھے۔

آخر کار چھٹی دعوت کے جواب میں نواب صاحب کے اخلاق اور محبت سے متاثر ہو کر مرزا نے رام پور جانے کا قصد کیا اور مرزا بھی نیشن کے متعلق باپس ہو چکے تھے اس زمانے میں نواب رام پور انگریزوں کے بڑے دوست سمجھے جاتے تھے مرزا نے سوچا کہ نواب صاحب کی وساطت سے انگریزی حکومت سے صلح صفائی ہو جائے تو بہتر ہے چنانچہ جنوری سنہ ۱۸۶۶ء میں مرزا رام پور تشریف لے گئے۔

نواب صاحب نے ان کی تعظیم اور خاطر و مدارات میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کیا اور بہت دوستانہ طور پر ملاقات ہوئی۔ نواب صاحب نے مرزا کے متعلق فیصلہ کیا کہ اگر وہ رام پور میں رہیں تو انھیں دو سو روپیہ ماہوار ملیں گے، سو روپے بطور مہمانی کے اور سو روپے تنخواہ کے۔ اور وصال ہی میں رہیں گے تو صرف سو روپیہ ماہوار ملیں گے پھر بھی مرزا صاحب تقریباً دو ماہ رام پور میں رہ کر دہلی چلے آئے۔

سرسید احمد خاں صاحب سے صلح | سرسید احمد خاں نے آئین اکبر کے مصنفہ ابو الفضل کی تصحیح کر کے

سے دوبارہ چھپوانا چاہا اور مرزا کے پاس اس کی ایک جلد بھیجی کہ وہ اس پر تقریباً لکھ دیں مرزا کو ابو الفضل کا طرز تحریر پسند نہ تھا اس کے علاوہ وہ اکبر کے آئین کو اس زمانے کے موجودہ آئین سے بہتر نہیں سمجھتے تھے اس لئے ان کو اس کتاب سے کوئی دلچسپی نہ تھی انھوں نے اس کتاب کے متعلق ایک مثنوی لکھ کر سرسید احمد خاں کے پاس بھیج دی جس میں اکبر کے آئین و قوانین

کو پیچ و پوچ ثابت کیا گیا تھا سر سید مرزا کی تقریظ سے خوش نہ ہوئے کتاب کو چھوڑ دیا لیکن اس میں مرزا کی تقریظ کو شامل نہ کیا اس وجہ سے دونوں میں کشیدگی پیدا ہو گئی۔

مرزا صاحب جب نواب رامپور سے ملاقات کر کے واپس ہوئے تو مراد آباد کی میرائے میں قیام پذیر ہوئے سر سید احمد خاں اس وقت مراد آباد میں صدر الصدور تھے ان کو جب مرزا کی آمد کا حال معلوم ہوا۔ تو بذات خود مرزا کو بلانے کے لئے میرائے میں پہنچے ان کا سامان اٹھوا کر مع ان کے ہمراہوں کے اپنے گھر لے گئے۔ جب مرزا پانچویں سے نیچے اترے تو شراب کی بوتل مرزا کے ہاتھ میں تھی مرزا نے اسے ایک جگہ رکھ دیا لیکن سر سید نے بوتل کو اٹھوا کر سامان کی کوٹھری میں رکھ دیا تاکہ ہر شخص کی نظر نہ پڑے مرزا نے جب بوتل کو اپنی جگہ پر نہ دیکھا تو بہت گھبرائے سر سید احمد خاں سے دریافت کیا آنکھوں نے کہا گھبرا ئے نہیں آپ کی بوتل بڑی احتیاط سے رکھی ہے مرزا نے کہا بھئی مجھے دکھا دو تاکہ اطمینان ہو جائے سر سید نے کوٹھری میں جا کر بوتل کو دکھا دیا مرزا نے بوتل کو ہاتھ میں اٹھایا اور اسے دیکھ کر کہا اس میں سے کچھ کم ہو گئی غالباً کسی نے امانت میں خیانت کی ہے سچ بتائیے کہ کس نے پی ہے سر سید احمد خاں اس بات کو شن کر منہ پرے اور ایک عرصہ سے جو ماہین کشیدگی پیدا ہو گئی تھی وہ دور ہو گئی۔

قانع برہان | قدر کے بعد جب ہر طرف امن و امان ہو گیا اور مرزا دستبوز کی تصنیف سے فارغ ہوئے تو آنکھوں نے

فارس کی ایک مشہور لغت برہان قاطع کو دیکھنا شروع کیا۔ اس وقت یہی کتاب ان کے پاس موجود تھی اس لغت کے مصنف محمد حسین تبریزی تھے جو دکن میں رہتے تھے مرزا نے اس کتاب کے بارہ میں صاحب عالم باہر کی کو ایک خط میں لکھا۔

”اس قدر مانگی کے دنوں میں برہان قاطع میرے پاس تھی اس کو میں دیکھا کرتا تھا۔ ہزار ہا لغت غلط ہزار ہا بیان لغو عبارت پرچ اشاعت پادہ جا۔ میں نے سو دوسو لغت کے افراط لکھ کر ایک مجموعہ بنایا ہے اور قاطع برہان اس کا نام رکھ دیا ہے۔“

یہ کتاب ۱۲۷۹ھ میں چھپ کر شائع ہوئی۔ اسی کتاب کو مرزا نے اضافہ اور ترمیم کے ساتھ دوبارہ چھپوایا تو اس کا نام ”دفعہ کا دیبائی رکھا قاطع برہان کی اشاعت کے بعد مرزا کی بڑی مخالفت ہوئی اور مرزا پر اعتراضات کی بھرمار ہو گئی۔ برہان کے جواب میں کئی رسالے محرق قاطع۔ ساطع برہان قاطع قاطع اور مؤید برہان کے نام سے شائع ہوئے جن میں برہان قاطع کی حمایت کی گئی اور مرزا کی تحقیق کو غلط ثابت کیا گیا۔ ”تیسخ نیز“ میں مرزا پر ذاتی حملے بھی کئے گئے اس کتاب کے مصنف مولوی امین الدین تھے مرزا نے ان پر الزام حیثیت عرفی کا مقدمہ دائر کر دیا۔ لیکن آخر میں دہشتوں کے کہنے سے راضی نامہ داخل کر دیا۔

مرزا کی وفات کے دس بارہ سال بعد ایران کے ایک مشہور مصنف رضاقلی خاں کی ایک لغت فرہنگ نامری ہندوستان میں آئی یہ کتاب

مرزا کی وفات کے چار برس بعد ۱۲۸۹ء میں چھپی اس کتاب میں فرہنگ چانگیری
فرہنگ رشیدی اور برہان قاطع کی غلطیوں اور لغزشوں کو بیان کیا گیا تھا۔
اور ایک باب میں تو صرف برہان قاطع کی غلطیاں ظاہر کی گئیں تھیں اور مرزا
غالب نے جو اعتراضات برہان قاطع پر کئے تھے وہ سب فرہنگ ناصری میں
موجود تھے اس فرہنگ کی اشاعت سے یہ ضرور ثابت ہو گیا کہ مرزا کے
منی لفین غلطی پر تھے اور مرزا حق پر تھے۔

از اہمیت عرفی کے مقدمہ کے ختم ہونے کے بعد حاسدوں اور مفلسوں
نے مرزا کے نام گناہ خط بھیجے شروع کے کسی خط میں ان کی تے خواری کا
علاقہ اڑایا جاتا اور کسی میں ان کی مذہب سے بیگانگی اور آزاد روی
پر لعن طعن ہوتی اس زمانہ میں مرزا نہایت کبیدہ خاطر اور رنجیدہ
رہا کرتے تھے۔

مولانا حالی لکھتے ہیں کہ اتفاق سے انھیں دلوں میں نواب معطفی خاں
کے ساتھ مجھے دہلی آنے کا اتفاق ہوا چونکہ مجھ کو ان نالائق گناہ خطوط کے
آنے کا حال معلوم نہ تھا ایک روز مجھ سے ایسی غلطی ہوئی جس کے تصور سے
مجھے ہمیشہ شرمندگی کہوتی تھی۔

ایک روز مرزا کی کبر سنی اور بزرگی کو بالائے طاق رکھ کر ان کو نصیحت
کرنی شروع کی چونکہ ان کا نقل سماعت انتہا درجہ کو پہنچ گیا تھا اور ان سے
بات چیت صرف تحریک کے ذریعہ کی جاتی تھی تاہم کی فرضیت اور تاکید پر
ایک لمبا چوڑا لکچر لکھ کر ان کے سامنے پیش کیا۔

مرزا کو یہ تحریک سخت ناگوار گزری اور ناگوار گزرنے کی بات ہی تھی
 موصفا اس وجہ سے کہ انہیں دلوں بعض لوگ گناہ خطوط میں ان کے
 مال اور افعال پر بہت نازیبا طریقے سے نفزبیں و ملامت کر رہے تھے
 بڑا صاحب نے میری لغو تحریر دیکھ کر فرمایا جو کچھ فرمایا وہ سننے کے لائق ہو
 یوں نے کہا یہ ساری علم فسق و فجور میں گزری نہ کبھی نماز پڑھی نہ روزہ
 ادا نہ کوئی نیک کام کیا زندگی کے چند سانس باقی رہ گئے ہیں اب اگر چند
 روز بیچ کر اٹھارے سے نماز پڑھی تو اس سے سارے گناہوں کی عافی کیونکر
 ہو سکے گی۔

بڑھاپے کے زمانے میں مرزا کئی بیماریوں میں مبتلا ہو گئے تھے ہاتھوں
 اور ان میں پھوٹے نکل آئے تھے جس سے اٹھنے اور بیٹھنے میں بھی
 بی تکلیف ہوتی تھی شراب نوشی نے ان کی صحت پر بڑا اثر ڈالا جو ان کی
 باتوں کا نقصان ظاہر ہوا بڑھاپے میں جب قوی کر دیا ہو گئے تو
 ان کے اثرات ظاہر ہونے شروع ہو گئے۔

غالب کو مدت سے مسلسل بول کا عارضہ تھا ذیابیطس بھی ہو گئی تھی
 پاؤں میں درم آگیا تھا اٹھنے بیٹھنے سے معذور ہو گئے تھے خون فساد
 بیماری بھی تھی بھل سماعت کی شکایت تو بہت پہلے سے تھی اب انکوں
 بھی کم نظر آنے لگا تھا وفات سے ایک روز پیشتر جب خواجہ حسامی
 دست کھیلے گئے تو مرزا بے ہوش تھے جب اتفاق ہوا تو اب علاء الدین
 طبع میں لکھوایا۔

میرا حال مجھ سے کیا پوچھتے ہو ایک آدھ روز میں میرے سہا یوں
سے پوچھنا۔

یہ شعر اکثر پڑھتے رہتے تھے۔

وہم واپسیں برسرِ راہ ہے

عزیزِ و اب اللہ ہی اللہ ہے

وفات آخر کار ۱۵ فروری ۱۹۶۹ء کو شاعری کا یہ آفتاب ہمیشہ کے
لئے غروب ہو گیا۔ شہر کے تمام اکابر اور علمائے ان کے جنازے
میں شریک ہوئے شیخہ حضرات جانتے تھے کہ ان کے جنازے کی نماز اپنی
رحم و روح کے مطابق پڑھیں لیکن ضیاء الدین احمد خاں نے تمام رسمیں
اہل سنت کے مطابق ادا کیں اس لئے کہ وہ غالب سے بہت قریب تھے
اور ان کے مذہب کے متعلق بہت زیادہ واقف تھے دہلی دروازہ کے
باہر ان کے جنازے کی نماز پڑھی گئی شہر کے ہزاروں آدمی ان کی میت
کے ساتھ تھے وہ حضرت نظام الدین اولیاء کی درگاہ کے قریب نواب
الہی بخش معروف اپنے خسر کے پہلو میں دفن ہوئے مرزا کا مزار پہلے شکستہ
حالت میں تھا لیکن اب ان کا مزار سنگ مرمر کا بنوا دیا گیا ہے۔ اور
کا بڑا والا سنگ سرخ سے قرین کیا گیا ہے۔ جو لوگ سندھوستان یا ہرون
سندھوستان سے دہلی دیکھے گئے ہوں وہ مرزا کے مزار کو بھی ضرور دیکھیں
ہیں ہر سال مرزا کے مزار پر ان کی برسی منائی جاتی ہے جس میں مرزا کا کلام پڑھا
جاتا ہے اور مرزا کی تعریف میں شعرا اپنا کلام بھی سناتے ہیں۔

مراد مراد اعظم



خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوئیں

مرزا کے اخلاق و عادات

مرزا کا مشرب صلح کل تھا

آزاد و ہوں اور مرا مسلک ہے صلح کل
ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے
مرد اس بات کا خاص خیال رکھتے تھے کہ ان سے کسی کی دل
زداری نہ ہو کسی سے مذہبی بحث نہ چھیڑتے کسی کے مذہب کو بُرا نہ
بتے ہندو مسلمان انگریز سب ہی سے ان کے دوستانہ تعلقات تھے ان
بے شاگردوں کا سلسلہ تمام ہندوستان میں پھیلا ہوا تھا۔

(۱)

بہا کے رہنے والے سید غوث علی شاہ قلندر سلسلہ قادریہ کے
شہور بزرگ تھے وہ بڑے سباح تھے شاہ صاحب جب دہلی گئے تو مرزا
الہ سے بھی ان کی ملاقات ہوئی وہ نہایت المساجد میں مقیم تھے۔
وہ تقریباً چھ ماہ تک دہلی میں فرود کش رہے مرزا کی شہرت سن کر پہلے
ذوہ خود مرزا صاحب سے ملنے کے لئے ان کے مکان پر گئے اس سے

بعد مرزا صاحب ہر دوسرے تیسرے دن شاہ صاحب سے ملنے کے لئے
گتے تھے اور بعض دفعہ کھانے کا ایک نوخوان بھی اپنے ہمراہ لیتے تھے۔
شاہ صاحب کو مرزا سے بڑی محبت تھی وہ ان کی بڑی قدر
کرتے تھے ان کی ملاحظات میں غالب کے مندرجہ ذیل اشعار پائے
گئے ہیں۔

اصل شہود شاہد و شہود ایک ہے جبراً ہوں پھر شاہد ہر کس حسیہ

بے خودی بے سبب نہیں غالب کچھ تو ہے جس کی پرورداری

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا تھا ڈیو یا مجھ کو چکونے نہ میں ہوتا تو کیا

اک کھیل ہے اور نگ سلیمان مژدیک اک بات ہے عجازِ مسیح مرآگ

(۲)

مرزا رجب علی بیگ سرور سے ملاقات

ایک مرتبہ مرزا رجب علی بیگ سرور مصنف فناء عجائب لکھنؤ
دہلی آئے اور مرزا غالب سے ملے مرزا نے مرزا رجب علی بیگ کا
توسنا تھا لیکن ان سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی دورانِ گفتگو میں
رجب علی بیگ نے مرزا سے پوچھا آپ کے نزدیک کس کتاب کی زبان

اُردو عمدہ ہے مرزا نے جواب دیا قصہ چہار درویش کی۔ رجب علی بیگ نے پھر پوچھا اور فساد عجائب کمپنی سے مرزا نے کہا ماحول و لا قوتہ۔ اس میں زبان کا لطفت ہی کہاں ہے ایک تک بند ہی ہے۔

جب رجب علی بیگ مُردہ چلے گئے تو انھیں بتایا گیا کہ جس سے آپ گھٹگو کر رہے تھے یہ خود رجب علی بیگ مُردہ تھے مرزا نے افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ پہلے ہی کیوں نہ بتا دیا دوسرے دن پھر سید عوث علی شاہ قلندر کے پاس زینت المساجد میں تشریف لے گئے ان سے سارا واقعہ بیان کیا اور کہا مجھ سے ناہوشنگی میں بڑی غلطی ہو گئی ہے ذرا میرے ہمراہ چلے رجب علی بیگ مُردہ کے پاس جا کر معذرت کرائیں۔

مرزا صاحب شاہ صاحب کے ہمراہ رجب علی بیگ کی قیام گاہ پر پہنچے رجب علی بیگ بڑے تپاک سے ملے مرزا نے کہا جناب رات کو میں نے فساد عجائب کے خور سے پڑھا اس کی خوبی اور رنگینی عبارت کیا بیان کروں نہایت ہی فصیح و مرصع عبارت ہے میرے خیال میں تو ایسی شہر نہ پہلے ہوئی نہ آگے ہوگی۔

غرضیکہ مرزا نے ایسی باتیں کر کے رجب علی بیگ کے دل سے غبار کو دھو دیا دوسرے دن ان کی دعوت کی شاہ صاحب کو بھی بلایا اور اس نے بھی میاں سرود کی عبارت آرائی کی بہت تعریف کی۔

اس کے بعد جب زیادہ مراسم بڑھ گئے تو مرزا رجب علی بیگ سرود کی تعریف گلزار سرود پر مرزا غالب نے ایک نہایت عمدہ تقریب لکھی

فراخ و صہلی

مرزا کی آمدنی اگرچہ بہت ہی قلیل تھی لیکن وہ غریبوں کی مدد کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے کوئی سائل ان کے دروازہ سے خالی ہاتھ نہ جاتا تھا اکثر اپنا بیج اور بے کس لوگ مدد کے لئے ان کے پاس آتے تھے۔ وہ اپنی حیثیت کے مطابق غریبوں اور بے کسوں کی مدد کرتے تھے۔ اس لئے اکثر تنگ رہتے تھے ایک مرتبہ لفٹنٹ گورنر نے ان کو سات پارچے کا خلعت مع تین رقوم جو اس پر دیا چیراسیوں نے حسب دستور انعام مانگا انھوں نے بازار میں خلعت کو فروخت کر دیا۔ اور جو رقم حاصل ہوئی انعام دیکر اپنے گھر سے چیراسیوں کو رخصت کیا۔

انھوں نے غدر کی تنگدستی کے زمانے میں بھی اپنے نوکروں کو علیحدہ نہیں کیا جو خود کھاتے تھے انھیں کھلایا اس زمانے میں بھی اپنے رشتہ داروں کی مدد کرتے رہے۔

مرزا اور آم

مرزا کو آم اور انگور بہت مرغوب تھے آموں کی فصل میں ان کے دوست ڈور ڈور سے بذریعہ پارسل ان کے لئے آم بھیجتے تھے کبھی کبھی مرزا صاحب بھی فرمائش کر کے اپنے دوستوں سے آم منگواتے تھے خود بھی شوق سے کھاتے تھے اپنے دوستوں کو بھی کھلاتے تھے۔

سیاح نے بیٹی سے جب آم بھیجنے کا ارادہ کیا اور مرزا صاحب کے دریافت کیا تو انھوں نے جواب میں لکھا۔

”آم مجھ کو بہت مرغوب ہیں انگوڑے کم عزیز نہیں لیکن بیٹی اور سوت سے یہاں پہنچنے کی کیا صورت والدہ کا آم یہاں دلائی اور پونڈی کر کے مشہور ہے اچھا پرتا ہے کمال یہ ہے کہ وہاں بہت اچھا ہوگا سوت سے دکی آم بھیجنا محض تکلف ہے دو روپے کے آم اور چار روپے کا محصول ڈاک۔ پھر سو میں سے شاید دس پہنچیں۔ یہاں ویسی آم انواع واقسام کے بہت پاکیزہ اور لذیذ اور خوشبودار افراتے ہیں۔ سوئے آم بھی بہت ہیں۔ رام پور سے لو اب حسب اپنے باغ کے آموں میں سے اکثر یہ سبیل ارضیاں بھیجتے رہتے ہیں اے لوانج بریلی سے ایک مہنگی ایک دوست کی بھیجی ہوئی آئی دو ٹوکے ہر ٹوکے میں سو آم کلو دار وغہ نے میرے دونوں ٹوکے کھولے دوسو میں سے تراسی آم اچھے نکلے۔

صاحب عالم مارہروی کو ایک دعوت نامہ کے جواب میں خط لکھا۔ نہار منہ آم نہ کھاتا تھا۔ کھانے کے بعد میں آم نہ کھاتا تھا رات کو کچھ کھاتا ہی نہ تھا جو کہوں (دو کھانوں کے درمیان) ہاں آخر روز بعد منہم معدی آم کھانے بیٹھا جاتا تھا بے تکلف عرض کرتا ہوں اتنے آم کھاتا تھا کہ آم پیٹ میں نہ سماتا تھا۔ اب بھی اسی وقت کھاتا ہوں مگر دس بارہ اگر بیوی غری آم بڑے چمکے تو پیچھا نہ

ایک صحبت میں کسی نے مرزا سے دریافت کیا کہ آموں میں کیا خوبیاں ہونی چاہئیں۔ مرزا نے کہا صرف دو باتیں۔ بیٹھا ہوا اور بہت تنگ مرزا کی یہ عجیب و غریب تعریف سن کر سب لوگ سنہیں پڑے۔
مرزا نے آموں کی تعریف میں ایک نظم بھی لکھی ہے جس کے چند شعر حسب ذیل ہیں۔

صفت انبہ

| | |
|-------------------------------|-----------------------------|
| آم کا کون مرد مہراں ہے | نمرو شاخ گوٹے و چوگاں ہے |
| تاکت کے جی میں کیوں ہوا راں | آئے یہ گوٹے اور یہ مہراں |
| نہ چلا جب کسی طرح مقارور | بادۂ ناب بن گیا انگور |
| یہ بھی ناچار جی کا کھونا ہے | شرم سے پانی پانی ہونا ہے |
| مجھ سے پوچھو تمہیں خبر کیا ہے | آم کے آگے نیشکر کیا ہے |
| نیکل اس میں نہ شاخ و برگ بار | جب خزاں آئے تب ہوا سکی بہار |

لطیفہ

ایک مرتبہ بہادر شاہ ظفر کے ہمراہ مہتاب باغ میں ٹہل رہے تھے چاروں طرف رنگ برنگ کے آموں سے لدے ہوئے درخت عجیب بہار دکھارہے تھے یہ شاہی باغ تھا جس کے آم سوائے شاہی خاندان کے کسی کو میسر نہ آتے تھے۔
مرزا معیش درختوں کے آموں کو بڑے غور سے دیکھ رہے تھے کہ

بادشاہ نے پوچھا۔ مرزا اتنے غور سے کیا دیکھ رہے ہو مرزا نے باآدب
 عرض کیا حضور! کسی نے کہا ہے ہر دانہ پر اس کے کھانے والے کا نام لکھا
 ہوتا ہے میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ کسی آم پر میرا نام بھی لکھا ہے یا نہیں؟
 بادشاہ یہ جواب سن کر بہت ہنسے اور دوسرے روز ایک ہنگامی وفد
 آموں کی مرزا کے گھر پر بھجوا دی۔

لطیفہ

مرزا کے ایک دوست کو آم اچھے نہیں لگتے تھے ایک دن وہ مرزا
 کے مکان پر بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک گدھے والا سامنے سے گزرا گدھے
 نے آموں کے پڑے ہوئے پھلکوں کو سونگھ کر چھوڑ دیا۔ دوست نے
 کہا مرزا صاحب دیکھئے آم ایسی چیز ہے جسے گدھا بھی نہیں کھاتا۔ مرزا
 نے جواب دیا بیشک گدھا آم کو نہیں کھاتا۔

خود داری۔۔۔ وندہ داری

۱۔ مرزا کی خود داری کا ایک واقعہ تو ہم ان کی سوانح حیات میں
 مفصل طور پر لکھ چکے ہیں کہ انھوں نے ولی کالج کی پروفیسری اس لئے
 قبول نہیں کی کہ پرنسپل صاحب جو انگریز تھے ان کے استقبال کے لئے
 باہر نہیں آئے۔ مرزا نے اس بات کو اپنی خود داری کے خلاف سمجھا۔
 اور بلا ملازمت کے واپس چلے آئے۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ کلکتہ کے سفر کے دوران میں کچھ دنوں انھوں نے لکھنؤ میں قیام کرنا مناسب سمجھا اس زمانہ میں نصیر الدین حیدر مسند نشین تھے اور روشن الدولہ نائب السلطنت تھے اہل لکھنؤ نے مرزا کا نہایت گرمجوشی کے ساتھ استقبال کیا اور ان کی بڑی خاطر و مدارات کی اور چاہا کہ نائب السلطنت کی وساطت سے مرزا شاہی دربار میں رسائی حاصل کریں مرزائے نائب السلطنت کی ملاقات سے پہلے دو شرطیں پیش کیں۔

(۱) نائب السلطنت میری تعظیم دیں۔

(۲) اس کے علاوہ نذر دینے سے مجھے مستثنیٰ رکھا جائے۔

یہ دونوں شرطیں مانی نہ جاسکیں لہذا مرزا نائب السلطنت سے ملاقات کئے بغیر کلکتہ چلے گئے اور اپنی شان خودداری کو قائم رکھا۔

(۳)

شہر کے معززین و عمائد جب تک ایک مرتبہ مرزا کے مکان پر نہ آئیں وہ خود کبھی ان کے مکان پر نہیں جاتے تھے اور جو شخص ان کے پاس آتا تھا وہ اس سے ملنے کے لئے اس کے مکان پر ضرور جاتے تھے۔

ایک دن دیوان فضل اللہ خاں گاڑی پر سوار مرزا سے بغیر ملے نکلے ہوئے چلے گئے مرزا کو جب اس کا علم ہوا تو انھوں نے ایک رقعہ لکھا۔

”آج مجھے جس قدر ندامت ہوئی ہے نرم کے مارے زمین میں گڑا جاتا ہوں“

اس سے زیادہ نالائق اور کیا ہو سکتی ہے کہ آپ کبھی کبھی اس
طرف سے گزریں اور میں سلام کو حاضر نہ ہوں۔“
دیوان جی اس رقعہ کو پڑھ کر بہت شرمندہ ہوئے اور اسی وقت
مرزا سے ملنے کے لئے آئے۔

مرزا کا حافظہ

مرزا کا حافظہ اور یادداشت کی قوت بہت زبردست تھی جو کتاب
ایک مرتبہ پڑھ لیتے تھے وہ ان کے دل پر نقش ہو جاتی تھی ان کے پاس کوئی
کتابوں کا ذخیرہ نہ تھا وہ کتابیں کراٹے پر منگواتے تھے اور ان کو پڑھ کر
وہیں کر دیتے تھے ایک آدمی خاص اس کام پر مقرر تھا جو انھیں کتابیں لا کر
دیتا تھا ان کتابوں میں جو ضروری اور اہم بات ہوتی وہ مرزا کے ذہن
میں محفوظ ہو جاتی تھی برہان قاطع کے جواب میں جو کتاب قاطع برہان لکھی
اسی حافظہ و یادداشت کی بدولت لکھی کوئی لغت یا کتاب ان کے
پاس موجود نہ تھی کہ اس سے مدد لیتے۔

مرزا کو شرعائے متقدمین جیسے حافظ سعدی، عرفی، بیدل وغیرہ
کا کافی کلام یاد تھا جس کو وہ اکثر مضامین یا خطوط میں بے تکلف استعمال
کر دیتے تھے۔

سخن فہموں کی قدر

مرزا کو جب کوئی سخن فہم اور ان کے کلام کو سمجھ کر ان کی قدر

والا مل جاتا تو اس کی بڑی عزت و خاطر و مدارات کرتے تھے۔
 ایک مرتبہ منشی نبی بخش حقیر جو کسی زمانہ میں کول (علی گڑھ) میں پیر رشتہ
 دار تھے اور جن کی سخن فہمی کی شہرت تھی وہی میں آئے اور مرزا کے مکان پر بکھرے
 مرزا کو ان کی تشریف آوری سے بڑی خوشی ہوئی چنانچہ منشی ہر گوپال تفتہ کو
 ایک خط میں لکھا کہ ۱۔

”خدا نے میری بے بسی اور تنہائی پر رحم کیا اور ایک ایسے شخص کو میرے پاس
 بھیجا جو میرے زخموں کا مرہم اور میرے درد کا دوا بنا اپنے ساتھ لایا اور جس نے
 میری اندھیری رات کو روشن کر دیا اور اس نے اپنی باتوں سے ایک
 ایسی شمع روشن کر دی جس کی روشنی میں نے اپنے کام کی خوبی جو
 تیرہ بجتا کے اندھیرے میں میری نگاہ سے غنی تھی دیکھی۔ میں حیران
 ہوں کہ اس فرزند بیکانہ یعنی منشی نبی بخش کو کس درجہ کی سخن فہمی اور
 سخن منجی، عنایت ہوئی ہے حالانکہ میں شعر کہتا ہوں اور شعر کہنا جانتا
 ہوں مگر جب تک میں نے اس پر نگوارہ کو نہیں دیکھا یہ نہیں سمجھا کہ
 سخن بھی کیا چیز ہے اور فن فہم کس کو کہتے ہیں۔ مشہور ہے کہ خدا نے
 سخن کے دو حصے کئے آدھا پر سن کو دیا اور آدھا بنی لوح انسان
 کو۔ کچھ تعجب نہیں کہ سخن فہمی اور ذوق معنی کے بھی دو حصے کئے گئے
 ہو۔ آدھا منشی نبی بخش کو اور آدھا تمام دنیا کے حصے میں آیا ہو۔
 گورنا نہ اور آساں میرا کہنا ہی مخالفت ہو میں اس شخص کی دوستی کی
 بدولت زمانے کی دشمنی سے بے فکر ہوں اور اس نعمت پر دنیا سے
 قانع۔“

مرزا کی داد پسندی

مرزا بہت انصاف پسند طبیعت رکھتے تھے جب کسی شاعر کا اچھا شعر سننے تو اس کی خوب داد دیتے تھے اور اپنے دوستوں میں اس کی بہت تعریف کرتے تھے اکثر اپنے شاگردوں کے اچھے اشعار سے متاثر ہوتے تھے۔

مومن۔ ذوق۔ اور سودا کے یہ تینوں اشعار مرزا کو بہت پسند تھے۔

- (۱) تم مرے پاس ہوتے ہو گو یا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
- (۲) اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے
- (۳) دکھلائیے لیجا کے تجھے مقرر کا بازار
لیکن کوئی خواہاں نہیں واں جس گراں کا

ظرافت

مرزا ہر جگہ اپنی شوخی اور ظرافت سے کام لے کر ایسی بات کہہ دیتے تھے جو سننے والوں کی ہچپی کا سبب بن جاتی تھی اور لوگ اس سے لطف اندوز ہوتے تھے۔

چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

(۱)

مرزا الہی بخش معروف مرزا کے خسر تھے وہ درویش تھے اور لوگوں کو مرید بھی کیا کرتے تھے اور بیت کے بعد ایک شجرہ پیری مریدی بھی ہر ایک کو دیا کرتے تھے ایک مرتبہ کسی مرید کو دینے کے لئے انہوں نے مرزا غالب کو ایک شجرہ دیا کہ اس کی نقل کر دیں۔ مرزا نے شجرہ اس طرح نقل کیا کہ ایک نام لکھا اور دوسرا خدت کر دیا پھر تیسرا لکھ دیا اور چوتھا چھوڑ دیا اس طرح جان بوجھ کر شجرہ کو غلط اور نامکمل نقل کر کے دے دیا۔

مرزا الہی بخش نے جب یہ شجرہ دیکھا تو بہت ناراض ہوئے اور مرزا سے دریافت کیا کہ یہ شجرہ تم نے کیا نقل کیا۔

مرزا نے جواب دیا قبلہ اس کا کچھ خیال نہ فرمائیے شجرہ دراصل خدا تک پہنچنے کا ایک ذریعہ ہے سوزینے کی ایک میٹھی اگر بیچ سے نکال دی جائے تو چنداں ہرج واقع نہیں ہوتا آدمی اچک اچک کر اوپر پہنچ سکتا ہے۔ یہ سن کر مرزا الہی بخش بہت خفا ہوئے۔ اور مرزا سے پھر بھی شجرہ نقل نہ کرایا اور مرزا کو غیر پسندیدہ کام سے ہمیشہ کے لئے نجات مل گئی۔

(۲)

ایک رات مرزا کے ایک دوست سید سردار مرزا۔ مرزا سے ملنے کے لئے ان کے مکان پر آئے جب وہ جانے لگے تو مرزا خود شمع لے کر ان کے ساتھ آئے تاکہ وہ روشنی میں اپنا جوتا دیکھ کر پہن لیں سردار مرزا نے کہا

تقد آپ نے کیوں تکلیف فرمائی۔ میں خود ہی جوتا پہن لیتا مرزا نے کہا میں
شیخ آپ کو جوتا دکھانے نہیں لایا بلکہ اس لئے کہ کہیں آپ میرا جوتا نہ پہن
جائیں۔

ایک صحبت میں ذوق اور دوسرے شعراء موجود تھے مرزا نے میر تقی
میر کے کلام کی تعریف کی ذوق نے کہا کہ سودا کا کلام میر کے کلام سے بہتر
ہے مرزا نے کہا میں تو آپ کو میری سمجھتا تھا مگر اب معلوم ہوا کہ آپ سودا
ہیں۔

ایک دن مرزا پٹنگ پر لیٹے ہوئے تھے میر مہدی نے پاؤں دبانے
شروع کئے مرزا نے ہر چند منع کیا لیکن میر نہ ملنے بلکہ کہنے لگے اگر آپ کو ایسا
ہی خیال ہے تو ہجرت دیدیجئے گا مرزا راہنی ہو گئے جب میر مہدی پاؤں
باب چلے تو ہجرت طلب کی مرزا نے کہا بھتیہ کیسی ہجرت تم نے میرے پاؤں
پر لے دیں نے تمہارے پیسے دابے حساب برابر ہو گیا۔

کسی نے مرزا سے پوچھا رتھ نہ کر ہے یا ٹونٹ تو انھوں نے فرمایا اگر
رتھ میں عورتیں بیٹھی ہوئی ہوں تو ٹونٹ اور اگر مرد بیٹھے ہوئے ہوں تو مسڈر
بکھا جائے۔

ایک مرتبہ رمضان کا مہینہ گزرنے کے بعد مرزا بادشاہ سے ملنے کے

لئے گئے بادشاہ نے دریافت کیا۔ مرزا تم نے کتنے روزے رکھے مرزا نے
جواب دیا پیر و مرشد ایک "نہیں رکھا۔"

مولوی امین الدین نے مرزا کی کتاب قاطع برہان کے جواب میں ایک
کتاب لکھی جس کا نام قاطع قاطع رکھا۔ اس میں تہذیب اور اخلاق سے گروے
ہونے ناشائستہ الفاظ استعمال کئے گئے تھے مرزا نے اس کا کوئی جواب
نہیں دیا۔ کسی نے پوچھا حضرت آپ نے قاطع قاطع کا جواب نہیں لکھا
مرزا نے کہا اگر کوئی گدھا تمہارے لات مارے تو کیا تم بھی اس کے لات
مارو گے۔

دہلی سوسائٹی

یہ سوسائٹی ۱۸۶۵ء میں قائم ہوئی سوسائٹی کے سکریٹری مارٹر منشی
جبار علی لال تھے یہ سوسائٹی اپنے جلسوں کی کارروائی اردو زبان میں،
ایک رسالے کی شکل میں شائع کرتی تھی شہر کے اکثر معزز اور تعلیم یافتہ لوگ اس
سوسائٹی کے ممبر تھے اس سوسائٹی میں مختلف فنون پر مضامین پڑھے جاتے
تھے مرزا غالب بھی کبھی کبھی اس سوسائٹی کے جلسوں میں شرکت کرتے تھے۔
۱۸۶۵ء کے جلسہ میں مرزا نے اس سوسائٹی کے جلسہ میں اپنا
ایک مضمون پڑھا عبارت نہایت رنگین اور مقفی تھی عندر کا حال بیان کرتے
ہوئے کہا۔

”تین برس کامل یہ حال رہا ہر شخص خستہ و بد حال رہا آب و ہوا کی
 ناسازگاری طرح طرح کی مصیبت۔ رنگ رنگ کی بیماری کیچوں
 کا تپ حرارت سے سلگنا۔ گھروں میں جا بجا آگ لگنا۔ ہوا شرارہ
 بڑی۔ خاک شعلہ انگیز۔ دریا اور کوئیں کا پانی زہر آب۔ مینہ کی
 پانی کی بوند گوہر نایاب۔ اسارہ اور سادون، برسات کے دو مہینے
 تمام ہوئے سادون کے آخر اور بھادوں کے اول دو چار مہینہ چلے
 جس میں پانی اس قدر برسا کہ زمینداروں نے حاصل فصل ربیع سے
 ہتھ دھوئے پایاں کا رکھا حال خدا جانے خلق اس کے امرا کو کیا چکا
 گزری اور ازانی ایک امر عام ہے مجھے خاص اپنے مدعا سے کام
 ہے بڑے حاجوں ناتواں ہوں سچ اگر پوچھئے تو نیم جاں ہوں۔
 ضعف نے غالب نکلا کر دیا

ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

میں کہاں اور بزم نشینی کہاں نظم و نثر میں وہ نگینی کہاں سرکار کی
 خدمت گزاری کا شائق ہوں مگر اب صرف دو کام کے لائق ہوں
 اگر تہ ربیعہ خط مجھ سے پوچھا جائے تو وہ لکھ سکتا ہوں جو میری ہے
 میں آئے یا اگر تحریر نظم و نثر اور دو کا حکم آدے تو لکھ کر بھیج سکتا
 ہوں آئندہ حکام کے پسند نہ ہو یا مقبول ہو جائے۔

مرزا غالب نے اس سوسائٹی میں جو مضامین پڑھے۔ ایک مضمون کے متعلق
 ماسٹر پیارے لال سکریٹری دہلی سوسائٹی نے حوالہ دیتے ہوئے کہا
 اس ملک کے آدمی احسان فروش نہیں۔ جو شخص ان سے ذرا سی محبت
 کرتا ہے یہ اس سے مرہ چند بلکہ جو چند محبت کر لے کو تیار رہیں بقول جناب
 مرزا آسدا اللہ خاں صاحب بہادر۔

ہندوستان کی بھی عجیب سرزمین ہے
 جس میں وفا و مہر و محبت کا ہے وفور
 جیسا کہ آفتاب نکلتا ہے شرق سے
 اخلاص کا ہوا ہے اسی ملک سے ظہور
 ہے اصل تخم ہند سے اور اس زمین سے

پھیلنا ہے سب جہاں میں یہ سیوہ دور دور
 یہ زمانہ مرزا غالب کا آخری زمانہ تھا۔ کہ جب مختلف قسم کے امراض
 نے حملہ کیا۔ آخر کار ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء میں مرزا کی وفات ہوئی اور ۱۲ مارچ
 ۱۸۶۹ء کو جمعہ کے دن سوسائٹی کی طرف سے ایک جلسہ ہوا جس میں مرزا کی وفات
 پر اظہار رنج و غم کیا گیا۔

مرزا غالب کے کلام کی خصوصیات

جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں مرزا کی ابتدائی تعلیم فارسی سے شروع ہوئی اور چونکہ قدرت کی طرف سے مرزا کو خاص قسم کا شاعرانہ دماغ عطا ہوا تھا اس لیے وہ گیارہ برس کی عمر میں شعر کہنے لگے تھے۔ اسی زمانہ میں انھوں نے ایک فارسی غزل لکھی جس میں ہر شعر کے آخر میں ”کہرچہ“ آتا تھا یعنی جس کی ردیف ہی ”کہرچہ“ تھی انھوں نے وہ غزل اپنے استاد شیخ معظم کو دکھائی یہ غزل دیکھ کر استاد نے کہا یہ ردیف تو کچھ اچھی نہیں ہے ایسے اشعار کہنے سے کیا فائدہ۔ مرزا یہ سن کر خاموش ہو گئے۔ فارسی کے شعرائے متقدمین کا کلام اکثر ان کے مطالعہ میں رہتا تھا۔ اتفاقاً ایک دن ظہوری کا ایک شعر ان کی نظر پڑ گیا جس کے آخر میں ”کہرچہ“ تھا وہ دوڑے ہوئے شیخ معظم کے پاس گئے اور وہ شعر دکھایا۔ شیخ کو یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی انھوں نے سمجھ لیا کہ یہ مرزا کا کسی دن میدان شاعری میں آفتاب کی طرح چمکے گا۔

علامہ عبد الصمد کی فارسی کی تعلیم نے مرزا کی فارسی کی قابلیت میں چار چاند لگائے مرزا کو فارسی کے مشہور شاعر تبدیل کا کلام بہت پسند تھا۔ اور وہ اکثر ان کے پیش نظر رہتا تھا اور وہ کلام ان کی قوت تخیل پر

چڑھ گیا تھا۔ لہذا مرزا اپنے فارسی کے کلام میں تبدیل ہی کی پیروی کرتے تھے۔ جن میں فارسی کی شکل ترکیبیں ہوتی تھیں اور اشعار بھی مشکل اور پچیدہ ہوتے تھے۔ شاعروں میں وہ اکثر فارسی کی غزلیں سناتے تھے۔

مرزا کو اپنے فارسی کلام پر خود بھی ناز تھا۔ چنانچہ ذوق کو مخاطب کر کے فارسی میں جو ایک شعر کہا ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ تم میرے فارسی کلام کو دیکھو اس میں طرح طرح کے معانی نظر آئیں گے میرے اردو کلام کو چھوڑو یہ تو میرا معمولی کلام ہے۔

مرزا اردو میں تفریح بلیغ اور تفتیش کے طور پر شاعری کرتے تھے یا دوستوں اور ولی عہد سلطنت کے کہنے سے کوئی اردو غزل کہہ دیتے تھے۔ لیکن مرزا کو کیا معلوم تھا کہ ان کا اردو کلام ہی ان کی شہرت کا باعث بنے گا اور اس کلام کو لوگ بقول مولانا محمد حسین مصنفہ عجبات عینک طرح آنکھوں سے لگائے پھریں گے۔

مرزا کا اردو کا ابتدائی کلام فارسی کی شکل ترکیبوں اور مشکل الفاظ سے پر نظر آتا ہے۔

(۱)

جز تھیں اور کوئی نہ آیا پردے کار
مگر تہنگی چشمِ سودگہا

(۲)

شب نما چشم سالی در تیز اندازہ تھا تا محیط بارہ صورت خانہ خمیازہ تھا

ایک قدم وحشت سے درس و تفراسکاں کھلا
(۴) جاوہ اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا

حسن بے پروا خس پیدار متاع جلوہ ہے
(۳) آئینہ زانوئے فتکرا متراع جلوہ ہے

ہوائے سیرگل آئینہ بے مہری قاتل
(۵) کہ انداز بخون عظیمین صد دل پسند آیا

مذکورہ بالا اشعار کا مطلب ملاحظہ فرمائیے۔

۱۔ شاید صحرایں وسعت کے باوجود حاسدوں کی آنکھ کی طرح

تنگ تھا جس کو سوائے محبوں کے کسی اور کی صحرانوردی گوارہ نہ ہو سکی۔

۲۔ اے ساتی رات کو میری مے نوشی کے شوق نے ایک قیامت

برپا کر رکھی ہے خمار کی حالت میں جو انگڑائیاں لے رہا تھا ان انگڑائیوں

نے تمام شراب خانہ پر احاطہ کر لیا تھا یعنی میری انگڑائیاں میخانہ میں

رکھی ہوئی تمام شراب کو اپنے قبضہ میں لے لینا چاہتی تھیں۔

۳۔ عشق اور محبت کے صحرا میں ایک قدم رکھتے ہی کائنات کی حقیقت

کا ایک درس مل گیا۔ یعنی یہی ایک ایسا راستہ ہے کہ جس کو اختیار کر کے

تمام دنیا کے اختلافات اور تفرقے دور ہو سکتے ہیں۔

۴۔ اگرچہ جس بے پروا ہے لیکن خود اس کی خواہش ہے کہ وہ خود اپنے

جلوے دیکھے اسی وجہ سے آئینہ اس کا زانوئے فکر بن گیا ہے کہ اسے
دیکھ کر وہ اپنے حسن کو اور زیادہ پرشش بنانے کے لئے کسی نئے
انداز کا اضافہ کرنا چاہتا ہے۔

۵۱، سرخ رنگ کے پھول جو ہوا سے ملتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لہل
خون میں لوٹ رہے ہیں ہمارے محبوب کو جو پھولوں کی سیر کا شوق پیدا
ہوا ہے وہ اس ظالم کی بیدردی کو ظاہر کرتا ہے اس لئے کہ اسے خون
میں تڑپتے ہوئے لہل لوگوں کو دیکھنے کا شوق ہے اور شوق پھولوں کے
ہوا میں ملنے سے بھی پورا ہو جاتا ہے۔

مرزا کے ابتدائی کلام کے متعلق لوگ کیا ہی خیال ظاہر کریں لیکن
مرزا کا راستہ تمام شاعروں سے الگ نظر آتا ہے وہ اپنی طرف کے جذبہ
ہیں اس مشکل پسندی اور پیچیدہ بیانی نے آگے چل کے ایک نہایت
آراستہ پیراستہ راستہ اختیار کیا حقیقت یہ ہے کہ اس شکل پسندی اور
پیچیدہ بیانی ہی نے اسد اللہ خاں کو غالب بنایا ان کے کلام میں
جو خصوصیات ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

پہلی خصوصیت | مرزا کے کلام میں جا بجا فارسی کی نئی نئی ترکیبیں
ملیں گی جن کو اساتذہ متقدمین نے یا تو استعمال
نہیں کیا اور اگر کیا تو بہت کم لیکن چونکہ اردو زبان مرزا کے خیالات
کی ترجمانی کے لئے کالی نہ تھی اس لئے مجبوراً انھوں نے فارسی کی ترکیبیں
اردو کلام میں استعمال کیں۔ یہی نہیں بلکہ ضرورت کے مطابق خود بھی بہت

سی ترکیبیں اپنی طبیعت سے خود ایجاد کریں۔

- ۱۔ دم شنیدن۔ (۱) آگہی دم شنیدن حسد پر چاہے بچھائے
مدعا غصہ ہے اپنی عالم تقدیر کا
- ۲۔ آتش خاموش۔ (۲) دل پر اسوزنہاں سوئے محال ہل گیا
آتش خاموش کے مانند گویا جل گیا
- ۳۔ جوہر اندیشہ۔ (۳) عرض کیجئے جوہر اندیشہ کی گرمی کہاں
اک خیال آیا تھا و شعا کا کہ صحر اہل گیا
- ۴۔ خانہ زاد زلف۔ (۴) خانہ زاد زلف میں زنجیر سے بھاگتے کیوں
ہیں گرفتار و خانہ زلف سے گھبراتے کیسا
- ۵۔ وادی خیال۔ (۵) ستانے کروں ہوں یہ وادی خیال
ماہ از گشت سے نہ رہے مدعا مجھے
- ۶۔ جنت نگاہ فرودیں گوش۔ (۶) لطف خرام ساقی و ذوق صدک چنگ
یہ جنت نگاہ فرودیں گوش کوش ہے
- ۷۔ دعوت فرگاں۔ (۷) کرتا ہوں جمع پھر جگر لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوت فرگاں کی ہوئے

ان اشعار کا مطلب ملاحظہ فرمائیے۔

- ۱۔ لوگوں کی عقل میرے اشعار کے معنی کو سمجھنے کی کتنی ہی کوشش کرے۔
لیکن میرے کلام کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔
- ۲۔ محبت کی پوشیدہ سوزش سے میرا دل بے محال جل کر خاک ہو گیا۔

اندر ہی اندر آگ اس طرح سلگتی رہی کہ کسی کو بھی خبر نہ ہو سکی۔

۳۔ ہم اپنے خیالات کی گرمی کا حال کہاں جا کر بیان کریں ذرا وحشت
محو کا خیال ہی کیا تھا کہ خیالات کی گرمی سے صحرا میں آگ لگ گئی۔

۴۔ ہم اپنے محبوب کی زلفوں کے غلام اور اس کے وفاداری کے پابند
ہیں اس لئے زنجیروں میں جکڑے جانے یا قید خانہ کی تکالیف سے بالکل
نہیں بگھراتے۔

۵۔ میں دلدلی خیال کے راستہ کو مست اور بے خود لوگوں کی طرح طے
کر رہا ہوں تاکہ مدہوشی کی حالت میں راستہ بھول جاؤں اور پھر واپس نہ
آسکوں۔

۶۔ ساقی کے چلنے کا لطف مٹکا ہوں کو جنت کا سماں دکھاتا ہے اور
چنگ کی ٹہریلی آواز کانوں کو بہشت کے نقیوں کا لطف دے رہی ہے۔
۷۔ میں اپنے جگر کے کردوں کو پھر جمع کر رہا ہوں تاکہ مزرگانِ یار کی
دخوت کردوں اس لیے کہ مزرگانِ یار کی دعوت کئے ہوئے ایک عرصہ
گزر گیا ہے۔

دوسری خصوصیت | مرزا کے کلام میں جدت بیان معنی آفرینی بہت
زیادہ ہے۔ تشبیہ۔ استعاروں اور کنایوں
سے وہ اپنے کلام کو مزین کرتے ہیں۔

(۱)

مر گیا صد مہ یک جنبش لب سے غالب تالوانی سے حریف دم عیسیٰ نہ ہوا

۱۰۰
 دمِ عیسیٰ سے لوگ زندہ ہوتے تھے لیکن اس شعر میں دمِ عیسیٰ ہی
 کو اپنی موت کا سبب بیان کیا ہے عیسیٰ کے وہ الفاظ جن سے لوگوں کو زندگی
 ملتی ہے میری موت کا سبب بن گئے جیسے ہی انھوں نے مجھے اٹھنے کے
 لئے کہا۔ میں اتنا کمزور تھا تو ان تھا کہ ان کے الفاظ کی تاب نہ لا کر مر گیا۔

(۲)

دل گزر گاہِ خیال سے وساغری بھی گر نفس جاڑہ سسر منزل تقویٰ نہ ہوا
 دل کو شراب اور وساغری کے خیال کے گزرنے کا اور نفس کو تقویٰ کا راستہ بتلایا
 فرماتے ہیں اگر ہمارا سانس پر مہیز گاری کی منزل کا راستہ نہ بن سکا تو
 کیا مضائقہ۔ شراب اور پیالے کا خیال تو دل کے راستہ سے گزر رہا ہے یعنی
 اگر ہم پارسا نہ بن سکے تو رند تو بن سکتے ہیں۔

(۳)

ہیں زوالِ آمادہ اجزا آفرینش کے تمام مہر گردوں ہے چراغِ رہبرِ بادیوں
 اس شعر میں سورج کو چراغِ رہبر سے تشبیہ دی ہے کائنات کے
 تمام اجزا فنا ہونے والے ہیں اور یہ سورج جو اتنا مستقل اور عظیم الشان
 نظر آتا ہے راستے کے چراغ کے مانند ہے کہ خدا جانے فنا کی ہوا سے کب بجھ جائے۔

(۴)

آگ سے پانی میں بجھتے وقت مٹھتی صدا ہر کوئی در ماندگی میں نالے سے لہجہ ہے
 جب پانی سے آگ بجھاتے ہیں تو اس میں سے آواز نکلتی ہے اس سے
 یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ در ماندگی اور مصیبت کے وقت ہر ایک کے منہ سے فریاد

کی آواز نکلتی ہے۔

نیسری خصوصیت مرزا کے کلام میں متانت اور سنجیدگی کے علاوہ شوخی اور ظرافت بھی ہوتی ہے اور یہ خوبی مرزا کو دوسرے شاعروں سے ممتاز کرتی ہے۔

(۱) میں اور نرم فے سے یوں تشنہ کام آؤں گریں نے کی تھی تو بہ ساقی کو کیا ہوا تھا
یعنی اگر میں نے شراب سے تو بہ کر لی تھی تو ساقی کو چاہئے تھا کہ وہ زبردستی مجھے پلا دیتا تاکہ نرم فے سے تشنہ کام تو نہ آتا۔

(۲) واعظ نہ تم ہو نہ کسی کو پلا سکو کیا بات ہے تمہاری شراب ٹھہر کی
واعظ کہتے ہیں کہ جو لوگ نیک کام کریں گے ان کو جنت میں پاک شراب ملے گی حضرت غالب واعظ سے مخاطب ہو کے کہتے ہیں کہ جسے نہ تم خود پی سکتے ہو نہ کسی کو پلا سکتے ہو واعظ تمہاری شراب ٹھہر کے کیا کہنے۔

(۳) دیکھو غالب سے گرو الچھا کوئی ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا
دیکھنا غالب سے جھگڑا امت کرنا اگرچہ وہ بظاہر لاندہب نظر آتا ہے لیکن پوشیدہ طور پر ولی ہے کہیں وہ برا بھلا نہ کہہ بیٹھے۔

(۴) کہاں میخانہ کا دروازہ نہ غالب کہاں اعظ پراتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے
یہ تو معلوم نہیں کہ حضرت واعظ جو دوسروں کو نصیحت کرتے تھے مے خانہ میں کیوں گئے، البتہ اتنا جانتے ہیں کہ ادھر ہم میخانے کے دروازے سے نکلے اور ادھر وہ حضرت داخل ہوئے۔

(۵) میں نے کہا کہ نرم ناز چاہیے غیر سے تہی سن کے تم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کیوں

فرماتے ہیں مجھے اپنے محبوب سے کہا کہ اس رقیب کو آپ نے یہاں کیوں
 بلایا ہے اس کو اپنی محفل سے اٹھا دیجئے۔ تو اس نے بجائے رقیب کو اٹھانے کے
 مجھے کیا اس طرح کہہ کر اپنی محفل سے اٹھا دیا۔

اظہار ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نیکوین ہاں منہ سے مگر باوہ دوشینہ کی ہو گئے
 فرماتے ہیں جب قبر میں نیکوین (فرشتے) مجھ سے سوال و جواب کرنے آئیں گے
 ان گھبرا کے خود ہی بغیر سوال و جواب کے بھاگ جائیں گے اس لئے کہ میرے منہ سے کل تاتا
 کے شراب پینے کی بو آ رہی ہوگی۔

چوتھی خصوصیت | مرزا کے اشعار کا طرز بیان بالکل انوکھا اور نرالا ہوتا
 ہے یا وہی انظر میں تو اس سے کچھ اور معنی نکلتے ہیں
 لیکن اگر غور کیا جائے تو وہ سراسر نہایت لطیف مطلب اور نکل آتا ہے اور یہ خصوصیت
 مرزا کو دوسرے شاعروں سے ممتاز کرتی ہے۔

ادنی دن گر زندگانی اور ہے اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے
 یعنی اگر کچھ اور دن زندہ رہے تو ہم نے فیصلہ کیا ہے۔

۱۱۔ ترک محبت کی کوشش کریں گے۔

۱۲۔ یا اس زندگی کی کشمکش سے کوششیں اختیار کر لیں گے۔

۱۳۔ یہی ایک کوئی آنکھوں کے آگے تو کیا بات کرتے کہ میں لب تشہ تفریحی تھا

۱۴۔ معشوق نے ایک دم جلوہ دکھا کر ہماری آنکھوں کو خیرہ کر دیا اور جلوہ دکھا کر
 زیر بات کے چلے گئے اور ہمیں بات کرنے کی جہاز بچھتی وہ باقی رہ گئی۔

۱۵۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو یہ طور پر اپنا جلوہ دکھا۔ پس ان کی آنکھوں

کے آگے کن بجلی سی کو نڈکی اور تاب نظارہ نہ لاکر بیوش ہو گئے۔ ایسا جلوہ دکھانے سے کیا فائدہ وہ کچھ بات بھی کرنا چاہتے تھے جو مدہوشی کی وجہ سے نہ کر سکے۔

(۴) درپہ بیٹے کو کہا اور کہہ کے کیا پھر گیا خفیہ عرصہ میں میرا لپٹا ہوا بستر کھلا۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ آج میں تمہارے ہی گھر پر ہوں گا لیکن خلتی دیر میں میں نے اپنا لپٹا ہوا بستر کھولا وہ غائب ہو چکا تھا۔

۷۔ میں خانہ بدوش اپنا بستر ساتھ لئے ہوئے محبوب کے دروازہ پر پہنچا اس نے میری پریشانی کو دیکھ کر کمال مہربانی سے اپنے دروازہ پر پڑا رہنے کو کہا لیکن خدا جانے اسے کیا ہو گیا کہ خلتی دیر میں میں نے اپنا لپٹا ہوا بستر کھولا وہ اپنے کے مودہ سے پھر گیا۔

مرزا معمولی خیال اور معمولی مضمون کو بھی تشبیہ
پانچویں خصوصیت | استعاروں کے ساتھ ادا کرتے ہیں کہ اس میں ایک کلام
 بن پیدا ہو جاتا ہے اور ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں جس سے کلام میں زور پیدا
 ہو جاتا ہے۔

(۱) شب ہجر کاٹے سے نہیں کٹتی۔ رات بھر نیند نہیں آتی تکلیف ہوتی ہے۔

معمولی مضمون ہے لیکن مرزا اس مضمون کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔

کافو کا بخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کلا

اے دوست تو مجھ سے ہجر کی تکالیف اور سخت جانی کا حال مت پوچھ
 میرے لئے ہجر کی شب گزرنے میں جو تکلیف ہوئی وہ اتنی سخت تھی جو فرہاد کو جوئے شیر
 لانے میں ہوئی۔

(۱) فرہاد اپنی ماکامی پر تیشہ مرہیں مار کر مر گیا اس کو اس انوکھے انداز میں بیان کرتے ہیں۔

تیشہ بغیر مر نہ سکا کوہ کُن اسد مر گشتہ خمارِ رسوم و قیود و تنفسا
فرماتے ہیں فرہاد کی موت تیشہ کے بغیر نہ ہو سکی مینی اس کا عشق اگر کافی ہوتا
تو شیریں کی موت کی خبر سن کر بغیر تیشہ کے ہی مر جاتا لیکن وہ دُنیا کے رسم و رواج
میں مقید تھا، اس لئے تیشہ اکر ہی مرنا پڑا

(۲) عاشق کے آہ و نالے میں اثر نہیں ہوتا اس کی وجہ لکھتے ہیں :-

دوستدار دشمن ہے اعتمادِ دل معلوم آہ بے اثر دیکھی نالہ نارسا پایا
میں دل پر کیا بھروسہ کروں وہ تو میری جان کے دشمن محبوب سے مل گیا ہے۔
اس لئے کہ میں اپنے دل سے آہ نکالتا ہوں تو محبوب پر اس کا اثر ہی نہیں ہوتا۔
(۳) آئینہ دیکھ اپنا سامنے لے کے ہو گئے صاحبِ کدولِ زندہ نے یہ کتنا غور و غما
مشتوق کو غور و غما کہ وہ کسی پر کبھی عاشق نہ ہوں گے لیکن آئینہ میں جیوں ہی
اپنی شکل دیکھی تو اپنے اوپر ہی فریفتہ ہو گئے اور ان کا وہ غور و خاک میں مل گیا۔

(۴) وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روئناں خلقِ لے خضر نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لئے
حضرت خضرؑ نے آپ حیات پی کر حیات جاوید حاصل کر لی ہے اور وہ اب بھی چھکوں
کو راستہ بتاتے ہیں۔

اے خضر اہل میں زندگی تو ہمیں حاصل ہے کہ دُنیا ہمیں جانتی ہے اور ہم جگہ
مشہور ہیں لیکن آپ حیات جاوید حاصل کر کے چھپے چھپے پھرتے ہیں تو یہ زندگی
کس کام کی۔

(۶) تاہم نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں مجموعہ خیال ابھی فرو فرود تھا
 ابھی میں محبت کے میدان میں مغربی تھا اور میرے پریشان خیالات
 بھی مرتب نہ ہوئے تھے کہ میں طریقہ محبت سے اچھی طرح واقف ہو گیا تھا
 اور عشق و محبت کے مضمون پر کتابیں مرتب کر رہا تھا۔
 مذکورہ بالا خصوصیات کے علاوہ مرزا نے عشق، قصوف، رندی، بخیاری،
 خودداری، غم، موت، یاس، شراب، رقابت، دشمنی، اخلاق پر لاجواب اشعار
 کہے ہیں۔

عاشقانہ

گو میں رہا رہیں ستم ہائے روزگار
 اب جفا سے بھی میں محروم ہم اللہ اللہ
 نظر لگے نہ کہیں اس کے دست باز کو
 عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی
 کرے ہے قتل لگاؤ میں تیرا دینا
 دل لگا کر آپ بھی غالب مجھی سوہ گئے
 نظارہ نے بھی کام کیا داں نقاب کا
 تسکین کو ہم نہ روئیں جو ذوق نظر ملے
 بھی نیکی بھی اسکے جی میں گرا جاؤ مجھے
 نہ ہے کرشمہ کہ بوں کو دکھاؤ ہکو فرب
 لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ
 لیکن تیرے خیال سے غافل نہیں ہا
 اس قدر دشمن اور باب و فاجانا
 یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں
 میری وحشت تری شہرت ہی سہی
 تری طرح کوئی تیغ نکلے تو آب دے
 عشق سو آتے تھے مائع میرا حساب مجھے
 مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی
 حورانِ خلد میں تری صورت نکلے
 جفائیں کہے اپنی یاد شرمناک و مجھ سے
 کہ بن کہے ہی نہیں سب خبر ہو کیا کہئے
 جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

کون جتنا ہو تری زلف کے سر پہ چمک
کہتے ہیں ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا
طاقت بقدر لذت آزار بھی نہیں
کچھ تجھ کو مزہ بھی مرے آزار میں آئے
حسکی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا
ہے کمر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

آہ کو چاہئے اک عمر افر ہونے تک
جو رے باز آئے پر باز آئیں کیا
بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے درندہاں
دے چھو شکایت کی اجازت کہ ستمگر
جفت اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب
کون مہتا ہے حریف سے مردانگ عشق

شوخی اور ظرافت

اس دور پر نہیں بار تو کعبہ سی کو ہوائے
نہیں کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مر آگے
رہے نہ ابھی ساغر و بیابان مرے آگے
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے
آدمی کوئی سہارا دم تحریر بھی بھٹا
جانوں کسی کے دل کی میں کیونکر کہے بغیر
سجد ہو مدد سے ہو کوئی خالق ہوا
مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

اپنا نہیں یہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں
ہر ایک بات پر کہتے ہونم کہ تو کیا ہے
عشق نے غالب سب ملکا کر دیا
ایساں مجھے روکے نے تو کچھ پیو ہے مجھے کفر
لو ہاتھ میں غیش نہیں اٹھوئی میں تو دم
یہ مسائل تصویب یہ ترا بیان غالب
زندگی اپنی جو اس شکل سے گزری غالب
بڑے جانتے ہیں زشتوں کے لکھے پر ناحق
کہتے ہیں جب رہی نہ مجھے طاقت سخن
جب بیکہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
میں نے نامہ کچھ نہیں غالب

ناصح

شورِ چندِ ناصح نے زخمِ پرنہک چھڑکا
حضرت ناصح گرائیں وید و ول فرسما
یہ کہاں کی دوستی ہو کہ ہے یہ دوست ناصح
گر کیا ناصح نے سکو قید اچھا یوں ہی
نہ لڑنا صبح و غالب کیا ہوا اگر اس شدت کی

آپ سے کوئی پوچھے غم نے کیا مڑا پا
کوئی سمجھ کو یہ تو سمجھا دے کہ سمجھا بیگ کہ
کوئی چاہے سنا نہ ہوتا کوئی غم گسار ہوتا
یہ جنوں عشق کے انداز چھٹ جائیگے کیا
ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے کہ یہاں پر

موت

ڈھانپنا کفن نے دلِ غمِ خوب برہنگی
ہوس کو ہے نشاط کا رکت کب کیا
جان دی۔ دی ہوئی اسی کی تھی
تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا
رہا اگر کوئی تا قیامت سلامت

میں ورنہ ہر لباس میں تنگ وجود تھا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا
اڑنے سے پیشتر بھی مرانگ زد و تھا
پھر اک روز مرنا ہے حضرت سلامت

فلسفہ رنج و غم

تیر جیات بند غم اہل میں دونوں ایک ہیں
غمِ مستی کا اسد کس سے ہو بزمِ مرگ علاج

موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پا کر
شمعِ ہر رنگ میں جلتی ہو کر ہونے تک

رنج سے نوگر ہوا انسان تو مٹ جانا ہونچ
 تشکیلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں گئی ہیں

قنوطیت (ریاس)

بس ہجوم نا اُمیدی خاک میں مل جائے گی
 مختصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید
 یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال پار ہوتا
 توڑ بیٹھے جب کہ ہم جامِ دہو پھر نکلو کیا
 جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا
 یہ جو ایک لذت ہماری سہمی بے حاصل ہیں
 نا اُمیدی اُس کی دیکھا چاہئے
 اگر اور جیتے رہتے ہیں انتظار ہوتا
 آسماں سے بادۂ گلفام گزرتا کرے
 وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

سوز و گداز

قفس میں مجھ سے رونا جہنم کتنوں نے دیکھا
 مرد ہے ضعیف آہ میں میرا و گردن میں
 کتنا ہے کون نالہ بلبل کو بے اثر
 خزاں کیا فصل گل کتنی ہیں کسکو کوئی موسم ہو
 ہوئے مرے ہم جو دھوا ہوئی کیوں غرقِ دیا
 نالہ کے ساتھ آگیا پیغامِ مرگ
 نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانئے
 گری ہے جسے کل بجلی وہ میرا آتشیاں کیوں ہو
 طعہ ہوں ایک ہی قفس جاں گداز کا
 پردے میں گل کے لاکھ جگر جاک ہو گئے
 وہی ہم ہیں قفس ہوا اور ماتم بال و پیکر ہے
 نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا
 رہ گیا خط میری چھپاتی پر کھلا
 بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

خمریات

مے سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو
پلاوے اوک سے ساتی جو ہم سے نفرت ہے
مجھ تک کب ان کی نرم میں آتا تھا درجہ
رات بیازمزم پستے اور صبح دم
قرض کی پیتے تھے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
اک گونہ بخودی مجھے دن رات چاہئے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شرابی دے
ساتی نے کچھ ملانہ دیا ہو شراب میں
دھوئے دھتے جامہ احرام کے
ننگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

تصوف

اُسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ کیا
نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
قطرے میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں گل
اصل مشہود و شاہد و مشہود ایک ہیں
ہر چند ہر ایک شے میں تو ہے
جلاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھکے
ہے کائنات کی حرکت تیرے ذوق سے
دل ہر قطرہ ہے ساز انا البحر
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں درجہ چار ہوتا
ڈوبیا مجھ کو ہونے نے نہ میں گاتا تو کیا ہوتا
کھیل لڑکوں کا ہوا دیدہ بینا ہوا
جیراں ہو پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں
پھر تجھ سی تو کوئی شے نہیں ہے
ہم سمجھے ہوئے ہیں اُسے جس بھیس میں تائے
پر تو سے آفتاب کے ذرے ہیں جان سحر
ہم اس کے ہیں ہمارا یو چھینا کیا

اخلاق

دو دنوں جہان دیکے وہ سمجھے کہ خوش ہوا
یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

نہ سترگر برا سکھے کوئی
روک لہ کر غلط چلے کوئی
نہ کہو گر برا کرے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی
بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آسان ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

رقابت

غیر بھرتا ہے لئے یوں ترے خط کو کاگر
رات کے وقت سے بے ساتھ رقیب کے لئے
کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے منہ
آتے وہ یاں خدا کرے پر نہ کر خدا کو پنا
سا منے آن مٹھیا اور یہ دیکھنا کہ یوں
میرے پتہ سے خلع کو کیوں تیرا گھر ملے
میرا سلام کہتو اگر نام نہ برے
بن گیا رقیب آخر تھا چورا زواں اپنا
عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر س کا آشنا
ہوا رقیب تو ہونا نہ رہے کیا کہئے
اسے کاش جانتا نہ تری رہ گزر کو میں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کہہ کر کوئی
نہ سترگر برا سکھے کوئی
روک لہ کر غلط چلے کوئی
بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آسان ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

آزادی و خودداری

ہندگی میں بھی وہ آزادہ و خود میں کم
وہ اپنی خود چھڑے لگے ہم اپنی وضع کیوں لیں
اے پھرتے در کعبہ اگر وہ نہ ہوا
سب مرنیکے کیا پوچھیں کہ ہم سی سرگزیں کیوں

تو پھر بے سنگدل تیرا ہی سنگ آستانِ کھنچ ہو
 پار کا دروازہ پائیں گے گر کھٹلا -
 میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا
 وقت سایہ دیوار نہ کھینچ

دعا کیسی کہاں کا عشق جب ہم بھڑنا ٹھہرا
 ہم بچا رہے اور کھیلے یوں کون جاے
 وہ وقت کششِ روانہ ہوا
 سر کی ہے قدر تو سہا سے بچے

دشمنی

دوست کی شکایت میں ہمنو ہنر باں اپنا
 کس دن ہمارے سر پہ نہ آئے چلکے
 آہ تار سا دیکھی نالہ نارسا پایا
 کس وقت دشمنی ہے دیکھا جیسے
 ہوئے تم دوست جو دشمن اسکا آستانِ کھنچ ہو
 بے سبب ہوا غالب دشمن آساں اپنا

تاکریے نہ غمازی کر لیا ہے دشمن کو
 کس روز پھینکے نہ ترا شا کئے عدو
 دوست دار دشمن ہے اعتمادِ دل معلوم
 دشمنی نے میری کھو یا غیر کو
 یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
 ہم کہاں کے داماتھے کس ہنر میں کیلتھے

شکایت اہل زمانہ

تم کو بے مہری یارانِ وطن یاد نہیں
 بدی کی اس نے جس ہم نے کی تھی باہانگی
 رکھ لی ہر خدا نے میری بے کسی کی شرم

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب
 کہوں کیا خوبی اذ ضلّٰع اہل زمانہ غالب
 مجھ کو دیا ر غیر میں مارا وطن سے دور

نیت

نیت دیکھو رات بھر نہیں آتی

موت کا ایک دن سبقت ہے

پھر نہ انتظار میں بیٹھ آئے عمر بھر آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں

پاسباں

سے وہ جس قدر دولت ہم منہی میں لے گئے
 یا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت کی ہے
 ن گیا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا چکا
 دور و دیوار ایک گھر سا بنا با چاہے
 ہارے آتشا بکلا ان کا پاسباں اپنا
 اٹھا اور اٹھ کے قدم میں پاسباں کے لئے
 یا بختیں ختمی دعا ہیں صرف دباں ہو گئیں
 کوئی ہمایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

شبِ غم

ہاں کس سے میں کہ کیا ہوا شبِ غم بری بلا ہے
 یا امیر مری ہوا شبِ غم ہے بلاؤں کا نزول
 و کا سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
 نہ اندر شبِ فرقت بیاں ہو جائے گا
 مجھے کیا بُرا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا
 آج ادھر کو ہی اسے گا دیدہ اختر کھلا
 صبح کرنا شام کا لانا ہے جسے شیر کا
 بے تکلف داغ مر مہرواں ہو جائے گا

بادِ فککان

ب کہاں کچھ لالہ گل میں نمایاں ہو گئیں
 اندر ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لہجہ
 خاک میں کیا صودہ ہیں ہو گئی کہ پناں گئیں
 تو نے مٹکھ ہائے گراں مایہ کیا کئے

فضیلت انسانی

گر فی ہمتی ہم پر برق تجلی نہ طور پر
ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل کشت تھی پسند
دیتے ہیں بادہ ظہر قریح خوار کھلے
ستارہ فرشتہ ہماری جنابت میں

متفرق اشعار

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کہے
کی مرے قتل کے بعد اس جفا سے تو بہ
بوسے گلِ نالہ دل دو چہرے محفل
میں ہوں عداوتِ سرگی کی آرزو غائبِ دل
ڈھانپا کفن نے واسع عیوب ہر سنگی
مجھ تک لب ان کی بزم میں آتا تھا تہہ کا
گو اتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں وہ سریش حال
نہ ہے کرشمہ کہ یوں اسے دکھاؤ ہم کو خیر
مست پوچھ کہ کیا حال ہے میرا تم سے پیچھے
ہم نہیں کہ حضری ہم پیروی کریں
ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے

نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا
ہوئے تم دوست جس کے دشمن ہمسکا آسمان کی
ہائے اس زود پشیاں کا پشیاں ہونا
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا
دیکھ کر طرزِ تپاک اہل دنیا جل گیا
تیس دن ہر لباس میں رنگ وجود تھا
ساتی نے کچھ طمانہ دیا ہو شراب میں
رہنے روا بھی ساغر و مینا جیرنگے
کہ یہ کہے کہ میر رہ گزر ہے کیا کہئے
کہ بن کہے ہی انھیں سب خبر ہے کیا کہئے
تو دیکھ کر کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے
جانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ہے
بے نیازی تری عادت ہی کا ہی

مرزا غالب کے کلام پر

تنقید کرنے والوں پر تنقید

حضرت جوش ملیح آبادی کی شرح دیوان غالب پر تنقید

یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ بعض شارحین غالب کے اشعار کا مطلب لکھنے وقت تو ان کی تعریف میں بہت زیادہ رطب اللسان نظر آتے ہیں۔ اور شرح لکھنے وقت خود وجد کرنے لگتے ہیں لیکن جب وہ دوسرے شعراء غالب کا موازنہ کرتے ہیں تو ان کو غالب کے کلام میں کوئی خصوصیت نظر نہیں آتی۔ خاص کر ذوق اور موسیقی کے کلام کو غالب کے کلام سے برتر اور اعلیٰ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کے کلام کو غالب کے کلام پر ترجیح دیتے ہیں۔

یہ بات اور بھی حیرت انگیز ہے کہ جو لوگ شرح دیوان غالب لکھ کر غالب کے نام سے فائدہ اٹھا رہے ہیں وہی غالب کو ذوق اور مومن سے کم تر درجے کا شاعر ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اس سے ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کے دلوں پر ان کی قابلیت کا سکہ جم جائے اور لوگ یہ سمجھنے لگیں کہ تنقید نگار غالب سے زیادہ قابل ہے اور اچھا شاعر ہے۔

شاعرین و عادیں حضرت حالی کو کہ جنہوں نے اول غالب کے اشعار کی شرح لکھ کر اور خود غالب سے ان کے اشعار کا مطلب دریافت کر کے ان کی مشکل کو آسان کر دیا اور نہ غالب کے اشعار کی شرح لکھنا یا ان کے اشعار کو اچھی طرح سمجھنا کوئی آسان بات نہ تھی۔ حضرت جوش ملیح آبادی نے دیوان غالب کی شرح لکھی ہے وہ ہر لحاظ سے ایک نہایت عمدہ شرح ہے۔ اور طلبہ کے لئے نہایت مفید ہے حضرت جوش اشعار کا مطلب لکھتے وقت خود غالب کی خوبیوں کے قائل ہوتے ہیں اور واہ وا کے نعرے بلند کرنے لگتے ہیں لیکن ذوق اور مومن سے مقابلہ کرتے وقت وہ غالب کی خوبیوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور انہیں وہی خوبیاں ذوق اور مومن میں نظر آنے لگتی ہیں اور ان کو غالب کا دامن ان خوبیوں اور اوصاف سے تہی نظر آتا ہے۔

غالب اور ذوق کا موازنہ کرتے ہوئے جوش ملیح آبادی کا فرماتے ہیں۔

”آج کل غالب پرستی کا دور دورہ ہے۔ بڑا کے معتقدوں کی کثرت
 ماننے لگے جوش عنایت سے پھر پھر پھر کرنا۔ بھر کی شاعرانہ خیالیں
 ایک ہی شخص کی جھولی میں ڈال دی ہیں اور زبان کا کوئی شاعر ان
 کی نظر میں نہیں جیتا۔ بعض مہل اشعار کو بھی سحر نگاہی ثابت کرنے
 کی کوشش کی جاتی ہے۔ مگر یہ بڑی بے انصافی کی بات ہے کہ سب
 کے حقوق چھین کر ایک شخص کو پیرائے جائیں۔ اور جانب داری کی
 انتہا یہاں تک پہنچ جائے کہ واقعات کی طرف سے آنکھیں بند کر کے
 مرزا کو حکیم قلا سقر، قوم پرست یا محبت وطن بھی ثابت کیا جائے۔
 اس قسم کے اصحاب جب بھی غالب اور ذوق کا موازنہ کرتے ہیں
 انھیں ذوق میں کوئی خوبی نظر نہیں آتی ذوق کو غالب کا ناکام منقلد
 کہنے میں بھی دریغ نہیں کرتے حالانکہ دونوں کی سخن گوئی کا عالم اتنا
 مختلف ہے کہ تقلید سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ذوق پر سب سے
 بڑا یہ اعتراض ہوتا ہے کہ وہ جذبات نگاہی جانتا ہی نہیں حالانکہ یہ
 بات حقیقت کے خلاف ہے۔

مذکورہ بالا عبارت سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ۔

۱۔ جوش صاحب غالب کی شاعرانہ خوبیوں کے قائل نہیں ہیں۔

۲۔ ان کے بعض اشعار کو مہمل جانتے ہیں۔

۳۔ مرزا غالب کو حکیم، فلاسفہ نہیں سمجھتے۔

۴۔ ذوق کو غالب کا مترقی سمجھتے ہیں۔

(۱) غالب کی شاعرانہ خوبیوں کے تمام اہل کمال اور ادیب معترف ہیں ان کے تمام اشعار شاعری کی گونا گوں خوبیوں سے بھرپور ہیں جن کو بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

(۲) مرزا کے جو اشعار شارحین کی سمجھ میں نہیں آتے وہ ان کو مہمل کہہ دیتے ہیں طباطبائی نے بھی اکثر اشعار کو مہمل کہا ہے طباطبائی کا جواب تو کسی دوسری جگہ ملاحظہ فرمائیے لیکن جوش صاحب نے جو طباطبائی کی نقل کرتے ہوئے غالب کے نو اشعار کی فہرست دی ہے ان کے متعلق وہ لکھتے ہیں

۔ اس قبیل کا کچھ اور انتخاب بھی ہو سکتا ہے یہ اشعار مہمل تو نہیں ہیں لیکن

اہمال کی حد کو ضرور پہنچتے ہیں اگرچہ شارحین اور معتقدان غالب نے

ان اشعار کے معنی اور مطلب بیان کرنے کی کوشش کی ہے لیکن

ضرورت سے زیادہ تکلف اور کھینچا تانی سے کام لینے کے باوجود

ذوق سلیم اور فہم صحیح کو اطمینان نہیں دلا سکے۔ غالب کے مہمل

اشعار یہ ہیں :

| | |
|---------------------------------------|-------------------------------------|
| شمارِ سجدہ مرغوب بت شکل پسند آیا | تماشاے بہک کف برونِ صدل پسند آیا |
| شبِ خماری شوق ساقی و سنجیز اندازہ تھا | تا مچھا بادہ صورتِ خانہ تمہیازہ تھا |

ایک قدم وحشت سے درس دفتر مکان کھلا
 نازش آیام خاکستر نشینی کیا کہوں
 کمال گروہی سہی تلاش دینہ پوچھ
 شب کو وہ مجلس فروز خلوت ناموس تھا
 نقش نازبت طناز بہ آنغوش رقیب
 ہم سے نک بیٹائی کس طرح اٹھا اٹھائے
 حسن بے پروا خرید رنارے جلوہ
 اس اعتراض کا جواب ہم جوش صاحب ہی کی تحریر سے دینا زیادہ مناسب
 سمجھتے ہیں اپنی شرح کے صفحہ ۵۰ پر فرماتے ہیں ۔

" اہل نظر کا یہ قول بالکل درست ہے کہ غالب کے کلام سے خواص ہی
 لطف اندوز ہو سکتے ہیں وجہ یہ ہے کہ کلام کا بیشتر حصہ عام مذاق اور
 معمولی فہم کی دسترس سے بالاتر ہے خاص کر وہ جیتہ جو بیدل کی طرز اور
 پیروی سے متعلق دھتا ہے اور جس میں فارسییت اور تعقید مصنوعی پائی
 جاتی ہے بہت سے ایسے اشعار ہیں کہ ان پر اہل دوکا اطلاق بھی مشکل
 سے ہو سکتا ہے عجیب و غریب اور نادر تشبیہات و دور دور کے نماناؤں
 استعاروں کی طلسم بندی کو خاص مذاق کے آدمی ہی سمجھ سکتے ہیں۔"
 جوش صاحب نے خود ہی تسلیم کیا ہے کہ غالب کے کلام سے خواص ہی
 لطف اندوز ہو سکتے ہیں ان کا کلام عام مذاق اور معمولی فہم کی دسترس سے
 باہر ہے۔ یعنی غالب کا کلام سمجھنے کے لئے بہت زیادہ اہلیت اور قابلیت

کی ضرورت ہے تو اگر کسی نااہل کی سمجھ میں ان کا کلام نہیں آتا تو یہ اس کی فہم و ادراک اور اہلیت کا قصور ہے۔ حضرت غالب خود فرماتے ہیں میرے اشعار کا سمجھنا آسان نہیں۔

آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچیلے
 شرعاً محتاج ہے اپنی عالمِ نقیر پر کا
 بعض شاعر نے اس زمانے میں بھی اعتراض کیا تھا کہ اُن کے کلام میں معنی
 نہیں ہوتے اس پر غالب نے فرمایا :-

یہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پرواہ
 نہ سہی گھر مرے اشعار میں معنی نہ سہی

جس عظیم ترین شاعر نے ہمیں اپنا موجودہ دیوان دیا وہ یہ بھی سمجھتا تھا
 کہ مہل شعر کیا ہوتا ہے۔ حضرت غالب اپنے اشعار کے متعلق خود لکھتے ہیں -
 گنجینہ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے
 جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

مولانا حالی۔ حسرت موہانی۔ بیخود و ہلوی وغیرہ شاعرین نے تو ان
 اشعار کو مہل نہیں سمجھا۔ چوش صاحب ان اشعار کو مہل سمجھتے ہیں تو انھوں
 نے ان کی شرح کیوں لکھی۔

(۳) مرزا غالب کو حکیم اور فلاسفہ تو خود چوش صاحب نے بھی تسلیم کیا ہے
 فرماتے ہیں کہ اُن کی شاعری تمام تر حکمت اور فلسفہ سے بھری ہوئی ہے
 آپ نے صفحہ ۵۳ پر خود ہی تحریر فرمایا ہے۔

”تصوف کی طرح فلسفہ عشق و محبت بھی مرزا کی شاعری کا ایک خاص میدان ہے اور اس قسم کے مضامین کی بھی ان کے کلام میں فراوانی ہے مگر وہ فلسفیانہ اور حکیمانہ انداز میں کہے گئے ہیں مرزا کی شاعری کا یہ وصف وہ وصف ہے جو ان کی دقت کے بعد ان کے کلام کی بے مثل مقبولیت اور شہرت کا باعث ہوا۔“

چنانچہ اس ضمن میں جوش صاحب نے غالب کے اشعار دیئے ہیں اور لکھا ہے :-

”اسی قسم کا اور بہت سا انتخاب آسانی سے چر سکتا ہے یہ حکیمانہ انداز مرزا کی شاعری کا طرز امتیاز ہے“

کیوں جناب یہ آپ نے آنکھیں بند کر کے مرزا کو حکیم اور فلاسفہ کیوں لکھ دیا اور اگر لکھ دیا تھا تو احترام کیوں کیا۔

(۴) جوش صاحب ذوق کو مرزا کا تہ مقابل بلکہ شتر کوئی ہیں مرزا سے بہتر سمجھتے ہیں۔

اول تو ذوق اور مرزا کا مقابلہ کرنا ہی سخت بے انصافی ہے اس میں کوئی انکس نہیں کہ ذوق اور مرزا کے ہمعصر شاعر تھے یہ صحیح ہے کہ ذوق قصیدہ گوئی میں اور مرزا کے قاتل ہیں ان کا کلام سادہ اور بے تکلف ہوتا ہے اکثر وہ اخلاقی شعر لکھتے ہیں۔ وہ اپنے زمانے کے استاد تھے لیکن جہاں تک غزل گوئی کا تعلق ہے ذوق اور غالب کا کیا مقابلہ خود جوش صاحب ایک جگہ لکھتے ہیں :-

”یوں تو مرزا کی غزل میں وہ تمام عناصر کم بیش پائے جاتے ہیں جو غزل گوئی کے دائرے میں سمجھے جاتے ہیں مثلاً معاملہ بندی، زہد و تقویٰ کی تضمیک، رندی، راز و نیاز، شکایت انسانہ، اخلاق خود داری، تصوف، فلسفہ عشق و محبت، سوز و گداز، درد و محبت، رشک و یاس و حسرت، آہ و فغاں، زائد مالی و غیرہ مگر ان پانچ عنصروں کی فراوانی ہے فلسفہ و عشق و محبت، تصوف، سوز و گداز، درد و غم، یاس یعنی قنوطیت، رندانہ مضامین ان پانچ اقسام کے مضامین کو مرزا کی شاعری کا سیدھا سمجھنا چاہئے شوخی طبع جو مرزا کی طبیعت میں قدرت نے ودیعت کی تھی ہر قسم کے کلام کی زینت بنی ہوئی ہے۔ اُسید کے مضامین یعنی عجائبات مرزا کے کلام میں ناپید ہے۔“

گویا غزل گوئی اور شاعری کے لئے جن اوصاف، جذبات اور خوبیاں کی ضرورت ہے وہ مرزا کی شاعری میں بدرجہ اتم و کمال موجود ہیں اور دوسرے شاعروں کو ان میں سے بہت کم حصہ ملا ہے۔

جوش ملیحافی صاحب غالب اور ذوق کے

کلام کا موازنہ کرتے ہیں۔

حضرت غالب نے ایک غزل لکھی

نویں رہن ہے بیدار دوست جاگئے رہا نہ طرز ستم کوئی آسماں کے لئے

سات اشعار کے بعد اسی زمین سات اشعار اور ہیں جو تھل حسین خانہ کا
کی تعریف میں کہے گئے ہیں۔

غزل کے اشعار یہ ہیں :-

- ۱۔ تو میرا میں ہے بیدار دوست جاں کے لئے
- ۲۔ بلائے گر مرثیہ یا رشتہ خواں ہے
- ۳۔ وہ زندہ ہم ہیں کہیں رشتہ خانی خلق نے خضر
- ۴۔ رہا بلا میں بھی میں مبتلائے آفت زسکا
- ۵۔ ملک نہ دور رکھا اس مجھے کہ میں ہی نہیں
- ۶۔ مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرثیہ امیر
- ۷۔ گدا سمجھ کہ وہ چپ تھا مری جو شامت آ
- ۸۔ حضرت ذوق نے بھی اس کے جواب میں اسی زمین میں ایک

غزل لکھی :-

- ۱۔ نہیں ثبات بلندی میں عز و شاں کے لئے
- ۲۔
- ۳۔ اگر امیر نہ ہم سایہ ہو تو خانہ یاسن
- ۴۔
- ۵۔ وہ سول بیتے ہیں ہم کوئی نئی تلوار
- ۶۔ صبا جو آئی خس و فخر گلستاں کے لئے
- ۷۔
- ۸۔

- ۱۔ رہی نہ طرزِ رستم کوئی آسماں کے لئے
- ۲۔ رکھوں کچھ اپنی بھی شرکانِ خونچکاں کے لئے
- ۳۔ يتم کہ چہ بنے عمر جاوداں کے لئے
- ۴۔ بلائے جاں و ادا تیری اک جہاں کے لئے
- ۵۔ دراز دستی قاتل کے استخاں کے لئے
- ۶۔ کرے نفس میں قراہم خس و اشیاں کے لئے
- ۷۔ اٹھا اور اٹھ کے قدم میں پاسبان کے لئے
- ۸۔

ذوق نے شعر نمبر ۲ و شعر نمبر ۳ و نمبر ۴ کا تو جواب ہی نہیں لکھا
صرف چار اشعار لکھے ہیں جن کی تعریف میں لکھا فی صاحب نے انتہا
کر دی ہے۔ فرماتے ہیں :-

مرزا کے مطلع میں معنی آفرینی تو بہت ہے مگر مضمون نچرل نہیں
یعنی حقیقت سے بعید ذوق کا مضمون اخلاقی اور انتہائی حیثیت کا ہے
اور دوسرے مصرع میں جو دلیل پیش کی ہے اس میں بھی حقیقت کی
ترجہانی ہے قابلِ داد ہے آسمان کا اوج بھی نظر آتا ہے اور اُنقاس میں پستی
بھی نظر آتی ہے۔

شعر نمبر ۲ مرزا کے مضمون میں شوخی اور بے باکی ہے اور اسی کو شعر
کی روح کہنا چاہئے مگر ذوق نے حقیقت کو ظاہر کرنے کی کوشش میں
معنی آفرینی کی داد دی ہے اور اس کی یہ کوشش بہت کامیاب ہی بیان
کی بے تکلفی دونوں کے یہاں برابر ہے۔

شعر نمبر ۳ غالب کا یہ شعر داندوستی کا مرہونِ منت ہے اس
میں معنی آفرینی کا حق تو ادا کیا ہے مگر مضمون میں تصنع کا رنگ پیدا ہو گیا
ہے ذوق نے اس قافیہ میں کسی قسم کا تکلف یا تصنع سے کام نہیں لیا
اور اس بے تکلفی سے ہانڈھا ہے کہ گویا سامنے کا مضمون تھا نزاکت خیال
کو معیار قرار دیا جائے تو غالب کا شعر قابلِ ترجیح ہے اور تصنع یا آوردگی
کی بجائے بے تکلفی کو پسند کیا جائے تو ذوق کا شعر خوب ہے۔

شعر نمبر ۴۔ اگرچہ ذوق کے شعر میں یہ لطف ہے کہ اس نے مصرع

اول کی رویت کو فعل کی صورت میں استعمال کیا ہے اور دونوں رویتوں میں تنوع پیدا کر دیا ہے یعنی صاحب گستاخ کے خس و خوار لئے ہوئے اور آئی نگر اس میں اسک نہیں کہ مرزا کا شعر لفظاً و معناً بہت فوقیت رکھتا ہے اور نمیشل نے اس شعر میں جو خوبی پیدا کر دی ہے وہ محتاج تو صیغہ نہیں۔
باقی اشعار چونکہ ہم قافیہ نہیں ہیں اس لئے مناسب یہی ہے کہ ان میں جو جو اشعار خاص طور پر قابل ستائش ہوں انھیں نقل کر دیا جائے مرزا کی غزل میں مدحیہ اشعار کو چھوڑ کر صرف تین شعراء ہیں ان میں یہ شعر بہت ہی لا جواب ہے۔

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا میری جو شامت آئے
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں لے پاساں کیلئے
(اب یہاں سے ذوق کی مدح میرانی شروع ہوتی ہے)
ذوق کی غزل کے وہ منتخب اشعار دیکھئے۔ جو ہم قافیہ نہ ہونے کی وجہ سے موازنہ میں شامل نہیں ہو سکے۔

۱۔ غر چھوڑ تو کسی عالم میں راستی کہ یہ شے
۲۔ اپنی کان میں کیا اس صنم نے پھونکا یا
۳۔ جیسا کہ مہر و محبت کہیں یہاں نکلتا
۴۔ بیان درد و محبت جو ہو تو کیونکر ہو
عصا ہے ہر کو اور سیف ہے ہواں کے لئے
کہ ہاتھ رکھتے ہیں کانوں پر سب ان کے لئے
تو ہم بھی جیتے کسی اپنے مہرباں کے لئے
روبان دل کے لئے ہونے دل زباں کے لئے
جوش ملیحابی صاحب ان اشعار کی تعریف کرتے ہوئے فرمائیں۔
پہلے شعر میں درد و بیان کے علاوہ راستی کے لئے عصا اور سیف

ان دونوں لفظوں کی تلاش حد تو صیغ سے بالآخر ہے وہ یہ ہے کہ راست
 کے معنی سیدھا بھی ہیں اور عصا اور سیف میں یہ وصف موجود ہے دوسرے
 شعر میں محاورہ کی بندش وجدانی کیفیت رکھتی ہے اور اس میں جو معنوی
 تضاد کا لطف ہے یعنی اثبات میں نفی کے معنی پیدا کرنا اور حقیقت کو ہاتھ
 سے نہ چھوڑنا۔ اس کی داد کہاں تک دی جائے تیسرے شعر میں لفظ مہرباں
 میں جو طنز ہے وہ لطف سے خالی نہیں چھوٹا شعر تو اردو شاعری اور قدرت
 ذوق دونوں کے لئے فخر و مباہات کا سرمایہ ہے شاید کسی اردو شاعر کا
 دیوان اس شعر کا جواب دے سکے۔ درد و محبت کا مزہ دل نے اٹھایا ہے مگر
 وہ زبان کا کام نہیں دے سکتا ہے بیان کرنا زبان کا کام ہے مگر اس نے
 یہ مزہ نہیں اٹھایا اور وہ دل کا کام نہیں دے سکتی۔ تو مزہ اٹھانے
 بغیر کیا کرے گی اسے تو دل ہی بیان کر سکتا ہے مگر اس میں گویائی کی طاقت
 نہیں پس درد و محبت بیان ہو تو کس طرح ہو۔ اس شعر کی عظمت کا اندازہ
 کرنے کے لئے تلسی داس کے اس شعر کو دیکھئے۔

شبام گور، کم کہوں بکھائی
 گرا نین بن بانی

میتا جی کی سہیلیوں نے رام چندر جی اور بھپن جی کا حسن و جمال
 دیکھا تو وہ اپنی مالکہ کے پاس آکر جو کچھ کہنے لگیں اور جو توصیف بیان کی
 اسے تلسی داس نے سہیلیوں کی زبان سے اس شعر میں بیان کیا ہے۔
 شبام۔ حسن ملیج۔ گور۔ حسن بیج۔ (مراد بھپن جی سے) کم یعنی کس طرح۔

بکھائی ۔ معنی توصیف ۔ رگرا ۔ معنی زبان ۔ انین ۔ معنی اندھی ۔ بین ۔
معنی آنکھ ۔ بانی ۔ گویائی ۔

یعنی اس حسن طبع اور صبح رکھنے والے نوجوانوں کے حسن کی تعریف کس طرح
کروں زبان اندھی ہے اس نے دیکھا ہی نہیں تو بیان ہی کیا کرے گی دیکھا آنکھ
نے ہے مگر اس میں گویائی نہیں دوسرے مصرعہ کے چار لفظوں میں معنی کا جو
وقت بند کر دیا ہے وہ بھی قابل دید ہے اس شعر کی عظمت پر خیال رکھ کر
اگر ذوق کا شعر زیر بحث پرکھا جائے تو صاف ظاہر ہے کہ اس شعر پر مصنف
جس قدر بھی تاذ کرے کم ہے ۔

اگر اچھے اشعار کی تعداد کو ایک معیار تصور کیا جائے ۔ تو ذوق کی
غزل بلاشبہ فوقیت کے درجے کو پہنچتی ہے ورنہ زیادہ سے زیادہ یہی کہا
جاسکتا ہے کہ دونوں باکمال اپنی اپنی جگہ اپنے اپنے رنگ میں فرد ہیں۔ اشیاء
امتحان اور پاس سبالی کے قوائی میں اگر مرزا بازی لے گئے ہیں تو جاوواں
جواں ، اڈاں اور زبان کے قوائی ذوق کا حصہ بن گئے ۔
آگے چل کر ذوق کی تعریف میں لکھتے ہیں :-

۱۔ اخلاقیات ، زبان کی صفائی ، بیان کی سادگی سلاست اور محاورہ
بندی میں ذوق کو امتیازی درجہ حاصل ہے محاورہ بندی میں
تو اس کا تیر مقابل کوئی نہیں اور زبان کے محاورات کو اس طرح
باندھتا ہے کہ اس سے بہتر محل استعمال خیال میں بھی نہیں آسکتا ۔

آپ نے جوش ملیحائی کی زبانِ قلم سے ذوق کی تعریف تو سن لی مومن
 نے بھی اسی انداز میں ایک غزل لکھی جس کا حوالہ حامد حسین قادری پروفیسر سینیٹ
 جانن کالج آگرہ نے اپنی کتاب تاریخ و تنقید میں دیا ہے ان تینوں ہاکمالوں کا
 موازنہ آپ کو اسی کتاب میں آگے کے صفحات میں ملے گا اس موازنہ سے
 آپ کو تینوں عظیم ہستیوں کی شاعرانہ خوبیوں کا اندازہ ہو جائے گا۔

جوش ملیحائی صاحب سے درخواست | اس میں کوئی شک نہیں
 نہایت عمدہ کرتے ہیں اور اس میں وہ معنی پیدا کرتے ہیں کہ ہر بات
 پر داد دینے کو طبیعت چاہتی ہے اب آپ سے درخواست ہے کہ آپ
 دیوانِ ذوق اور دیوانِ مومن کی بھی شرح لکھیں تاکہ اہل ادب پران بزرگوں
 کی دوسری شاعرانہ خوبیاں اور شاعرانہ کمالات ظاہر ہو سکیں لیکن دیکھئے
 شرح لکھتے وقت ذوق کے ان اشعار کی خوبیاں ضرور بیان کیجئے جو
 ذیل میں دیوانِ ذوق سے اخذ کر کے لکھے جاتے ہیں۔

نامرد مرد، مردِ جوانِ مردِ بن گیا
 سب اڑ گئی مٹی کی دھڑی دھڑی کے بعد
 پھر جایا اس نے لعل لب پہ لاکھاپان کا
 ذوق ہر بہت قابلِ پوسہ سے اس بتِ خانی
 جب ناتھ سے کھڑا ہو وہ دیکھ کر کہہ رہا تھا

پیرمناں کے پاس وہ فائدہ چوہاں ذوق
 اس لعل و لب کے سم نے لٹی تو سے اس قدر
 دیکھنا اے ذوق ہوئے آج پھر لکھوں کہ خون
 ایک پتھر چوئے کشمیری کعبہ گئے
 جو دیکھے اسکو تھام کے دل بیٹھ جائے ذوق

کہاں تلک کہوں ساقی کہ لا شراب تو دے
نئے میں ہوش کسے جو گئے حساب کرے
کب حق پرست زائد حجت پرست ہے
تم ہری مل کر نہ عوفہ سے نکالا منہ کرو
سجد میں اس نے ہم کو نکھیں دکھائے مارا
دو بے شراب ڈبو کر کوئی کہا تے دے
جو کچھ کو دینے ہیں توبہ سے بلا حساب تے دے
خودوں پہ مرد ہلچے یہ شہوت پرست ہے
اور نہیں گرا مانتے تو جاؤ منہ کالا کرو
کافر کی دیکھو شہرخی گھر میں خدا کے مارا

حضرت علیا طبائی نے غالب کے مذکورہ بالا اشعار
- نوید ہیں ہے - کی جو تشریح کی ہے وہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں وہ
ہم ناظرین کی تفریح طبع کے لئے ذیل میں درج کرتے ہیں -
۱۔ مشرق کی بیداد نے بے واؤ فلک سے بے خوف کر دیا کوئی ستم
اٹھا ہی نہ رکھا اب نیا انداز ستم آسماں کو کہاں سے ملے گا آتش کہتے ہیں
گردشیں چشم بہاں سے خاک میں ہم مل گئے
حوصد باقی فلک کو رہ گیا بیداد کا
لفظ طرز پہلے مؤنث تھا اور ولی ہیں اب بھی مؤنث ہے مگر لکھنؤ
میں عام محاورہ اس کی تذکیر کا ہے۔ ہاں چند غزل گو جو زبان میں قیاس
کیا کرتے ہیں وہ اب بھی مؤنث باندھتے ہیں لیکن خلاف محاورہ معلوم
ہوتا ہے کانوں کو۔ میرا شعر ہے -

طرز دکھلا دے اس کی قامت کے
پاؤں پڑتا ہوں میں قیامت کے

(۲) اگر اس کا مژہ خوں خوار ہے تو میری مژہ بھی خونبار ہے اگر سب اسی کو دیدوں تو اپنی مژہ کے لئے کیا رکھوں۔

(۳) یعنی ایسی عمر جاوید کس کام کی کہ چوروں کی طرح چھپتے پھرتے ہو۔
(۴) اور ابلا بھی تو میرے ہی لئے ہوتی ہے سارے جہان کے لئے کیوں ہوئی۔

(۵) یہ سچ ہے کہ دراز دستی کا امتحان بھی ہو سکتا ہے جب پنچر یا گشتی تیغ زن سے دور ہو لیکن کیا ایک میں ہی امتحان کے لئے وہ گیا ہوں اور بھی تو گشتی ہیں اگر قاتل کی زد سے رکھنا ہے تو دور رکھ۔

(۶) یعنی میری کوشش بے سود اور قابلِ رحم بھی ہے۔

(۷) وہ سے پاساں مراد ہے کہ پہلے وہ ساحل کو درمشرق پر آنے سے مزاحم نہ ہوا تھا لیکن ان کی شامت جو آئی تو اس کے پاؤں پر گر پڑے اس سے وہ مطلب سمجھ گیا اور گردن میں ہاتھ دیا اس شعر میں ایسی بندش پائی جاتی ہے کہ جواب نہیں۔

اگر ان اشعار کی تشریح میں کوئی بات سمجھ میں نہ آئی ہو تو باقر صاحب کی تشریح بھی ملاحظہ فرمائیے۔

۱۔ نوید یعنی خوش خبری۔ بیدار دوست مری جاں کے لئے امن اور چین کی خوشخبری ہے کیونکہ دوست نے کوئی طرہ دستم آسماں کے لئے ہاتی نہیں رکھی سبھی قسم کے ظلم اس نے مجھ پر ختم کر دیئے لہذا میری جان جو بد فلک سے بے خطر ہو گئی۔

۷۔ اگر خرگان یا رشتہ خوں ہیں تو ہو اکریں آخر میری شرکاں بھی تو خوں نشاں ہیں اس لئے مجھے چاہئے کہ کچھ خون میں اپنی شرکاں کی خوں نشانی کے لئے دکھ لوں تمام کا تمام خون شرہ یار کی نظر نہ کروں اگر میں سب خون اس کے حوالہ کر دوں گا تو میرے پاس اپنی شرکاں کے لئے کیا رہے گا۔

۸۔ خضر عمر جادواں کے مالک ہیں کہتے ہیں کہ جناب خضر آپ کی عمر جادواں کس کام کی۔ کسی سے ملتے جلتے ہو نہ کسی کو دکھائی دیتے ہو۔ بلکہ عمر جادواں کے لئے چورین گئے ہو بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہے زندہ ہم ہیں کہ تمام دنیا سے روشناس ہیں اور ہر ایک سے کھلم کھلا ملتے ہیں۔ ۹۔ میں مصیبت میں مبتلا ہوں لیکن پھر بھی رشک نے مجھے نہیں چھوڑا یعنی مصیبت میں مصیبت یہ ہے کہ میں مبتلا رہے رشک و آفت ہوں اور یہ رشک اس بات کا ہے کہ تیری ادا بلا ہی سہی لیکن وہ سارے جہان کے لئے بلا کیوں ہے مطلب یہ ہے کہ اگر بلا تھی تو صرف میرے لئے ہونا چاہئے تھی۔۔

۵۔ اے فلک یہ درست ہے کہ قاتل کی دراز دستی کا امتحان اس وقت ہو سکتا ہے جبکہ شکار اس سے دور ہو لیکن کیا صرف میں ہی اس امتحان کے لئے رہ گیا ہوں کہ تو نے مجھے قتل سے دور رکھا ہے اے فلک مجھے اس سے دور نہ رکھ قاتل کی دراز دستی کا امتحان ہو سکتا ہے۔

۶۔ میری کوشش اور سعی کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی ابیر پرندہ قفس میں

آشیا نہ بنانے کے لئے تنکے جمع کرتا ہے گویا میری کوشش بے سود بھی ہے اور قابلِ رحم بھی بقول حالی اس سے زیادہ سختی کسی پیرایہ میں ادا نہیں ہو سکتی۔

۷۔ (حالی) غالب نے اتنے بڑے مضمون کو کہ میں معشوق کے مکان پر پہنچا تو اول غایب کھڑا ہا پھر پاسبان کے قدموں پر گر پڑا اب اس نے جانا کہ اس کا مطلب کچھ اور ہے اس لئے میرے ساتھ وہ سلوک کہا کو ناگفتہ بہ ہے۔ اس شعر میں ادا کیا ہے۔

(طباطبائی) جو واقعہ میرزا نے اس شعر میں بیان کیا ہے اس میں دو باتوں کی تصریح کرنی ضروری تھی ایک تو یہ کہ پاسباں نے سائل کے ساتھ کیا سلوک کیا دوسرے یہ کہ سائل پاسباں سے چاہتا کیا تھا تو یہ دونوں باتیں بصراحت بیان نہیں کی گئیں صرف کنایہ میں ادا کی گئی ہیں مگر صراحت زیادہ وضوح کے ساتھ فوراً سمجھ میں آ جاتی ہے پہلی بات پر لفظ شامت اور دوسری پر قدم لینا صرف (صراحت کرتا ہے) ولالت کرتا ہے اس کے سوا دوسرے کی نشست اور الفاظ کی بندش اور ایک وسیع خیال کو دوسرے میں ایسی خوبی سے ادا کرنا کہ نثر میں بھی اس طرح ادا کرنا مشکل ہے یہ سب باتیں نہایت تعریف کے قابل ہیں۔

اقتباس تازنخ و تنقید

جناب حامد حسین قادری مصنف تازنخ و تنقید نے اپنی کتاب میں

ہم وزن و قافیہ اور ہم ردیف غزلوں میں غالب مومن ذوق کا جو سوا نہ
 کیا ہے ہم اسے مجتہد ان کی کتاب سے نقل کرتے ہیں تاکہ اہل نظر و اہل
 دانش تینوں عظیم ہستیوں کے کمالات کے متعلق صحیح اندازہ لگا سکیں۔

ہم بھر و ہم قافیہ اشعار میں مختلف شاعروں کی رسائی فکر و رفعت
 تخیل تلاش الفاظ اور اسلوب بیان کے مقابلہ کا خوب موقع ملتا ہے نمونہ
 کے طور پر ہم غالب، مومن اور ذوق کے چند اشعار کا موازنہ کرتے ہیں۔
 غالب شاعری کے لئے پیدا ہوئے تھے اور شاعری ان کے لئے ان کے
 علو تخیل کا یہ عالم ہے کہ وہی سے لیکر آج تک یہ بلند کی کسی کو نصیب نہیں
 ہوئی۔ مومن بھی شاعرانہ طبیعت اور عاشقانہ دل لائے تھے ان کی
 طبیعت میں ایک مزہ تھا یہ سچ ہے کہ لطافت تخیل رفعت فکر اور جدت
 بیان میں غالب کے بعد مومن ہی کا درجہ ہے ذوق صرف شاق تھے
 قادر الکلام تھے استاد تھے ادب ان کی پر دانہ سطح سے صرف چند گز بلند
 ہے مادہ اسباب و مافوق السماء ان کی رسائی سے بلند تر۔ زبان پران کے
 بڑے احسانات ہیں لیکن حقیقت شاعری ان کی مومن نہیں وہ ان دل
 والوں میں نہ تھے جن کی ہر آہ مرثیہ دل ہر کراہ دیوان درد ہوتی ہے ان کی
 طبیعت میں مزہ نہ تھا اسی لئے ان کی شاعری بے مزہ ہے۔

زمین مقابلہ (زبان کے لئے فعاں کے لئے) میں غالب کے چودہ
 شعر ہیں جن میں ۵ شعر کا قطعہ مدحیہ بھی شامل ہے مومن کے ۱۴ ذوق کے

۲۸۔ غالب کا گہرا رنگ یہاں نہیں ہے مومن کی رنگینی بڑی حد تک روشن ہے۔ ذوق اپنی پوری رنگارنگی کے ساتھ چمک رہے ہیں بہت دور لگتا ہے اس میں شک نہیں کہ خوب خوب شعر نکالے ہیں میں شعر ہی شعر ہیں شاعری کچھ نہیں ذوق نے آسمان کا قافیہ چارج کر باندھا ہے۔

(ذوق)

نہیں ثبات بلندی عز و شایاں کے لئے
کہ ساتھ ادح کے پستی ہے آسماں کے لئے

ہزار لطف ہیں جو ہر ستم میں جاں کیلئے
ستم شریک ہوا کون آسماں کے لئے

وہم عروج ہے کیا فکر زردیاں کے لئے
کستہ آہ تو ہے پام آسماں کے لئے

بلند ہو دے اگر کوئی میرا شعلہ آہ
تو ایک اور ہو خورشید آسماں کیلئے

چاروں شعروں میں کوئی بلند اور نیا خیال نہیں صرف ہزار لطف والے شعریں البتہ ایک لطف ہے مومن نے ایک بات پیدا کی ہے۔
فرماتے ہیں :-

نہ پائے یار کے بوسے نہ آسماں کے لئے
عبث میں خاک ہو امیل آسماں کے لئے

مومن کے اس مطلع میں ان کے منہم ہونے کی طرف اشارہ ہے۔

لیکن غالب کا مطلع تجنیل کا عجیب نمونہ ہے ذوق کے پُر لطف شعر
 کے ساتھ پڑھیے اور دونوں کو بار بار پڑھ کر سوا ذہن کا لطف اٹھائیے
 کہتے ہیں :-

نورِ امن ہے بیدار و دوست جاں کے لئے
 رہی نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کے لئے
 مان تینوں کی زبان آرائی ملاحظہ ہو ذوق کہتے ہیں :-
 مزے یہ دل کے لئے تھے نہ تھے زباں کے لئے
 سودل میں ہم نے مزے سوزشِ جہاں کے لئے

بیانِ دردِ محبت جو تو کیوں کر ہو
 زبانِ دل کے لئے ہو نہ دلِ زباں کیلئے
 وہی سوجھیں ہیں کہ سطحِ آب سے بلند نہیں ہوتیں -

میزین کا شعر ہے اور کس قدر بلند و بامزہ ہے -
 مزہ یہ شکوہ میں آیا کہ بے مزہ ہوئے وہ
 میں تلخ کام رہا لذتِ زباں کے لئے

مضمون کی شگفتگی کے ساتھ مزہ اور بے مزہ کا تفاوت تلخ کام
 کا انتخاب اور لذتِ زبان کی ایجاد بھی دیکھئے غالب کے یہاں
 قافیہ مدحیہ میں ہے لیکن رنگِ غزل سے خالی نہیں اور اپنے لطفِ بیا
 سے قبولِ عام و بقائے دوام کا مالک ہے -

زباں پہ بارِ خدا یا یہ کس کا نام آیا کہ میرے نطق نے برے مری زباں کے لئے

آشیاں کا قافیہ دیکھئے ذوق کے یہاں پھر وہی قافیہ پیاٹی ہے
 صبا جو لائے غصہ و خار گلتاں کسے لئے
 قفس میں کیونکہ نہ تڑپے دل آشیاں کیلئے
 مومن کا مضمون دیکھئے ۔

کہاں وہ عیش اسیری کہاں وہ امن قفس
 ہے بیم برق بلا رذر آشیاں کے لئے
 غالب نے خوب مثال پیدا کی ہے ۔

مثال یہ مری گشت کی ہے کہ مرغ اسیر
 کرتے قفس میں فراہم غصہ آشیاں کے لئے
 جاوداں کے قافیہ میں ذوق نے بہت زور لگا کر ایک بات پیدا
 کی ہے ۔

اگر اُمید نہ ہما یہ ہو تو خاندانِ یاس

بہشت ہے ہمیں آرام جاوداں کے لئے

مومن نے بھی اس قافیہ پر پوری قوت صرف کی ہے لیکن اس
 کو گندن کا نتیجہ کاہ بر آوردن نہیں ہوا بلکہ زور ایجاد سے دلچسپ
 مضمون پیدا کیا ہے۔ فرماتے ہیں :-

خلاف وعدہ فردا کی ہم کو تاب کہاں

اُمید کشیدہ ہے یاس جاوداں کے لئے

غالب نے جو شعر کہا ہے وہ نہایت بے ساختہ سے خضر کا مضمون

عام ہے لیکن شاعری کی قدرت طرازی نے شوخ مقابلہ کر کے خوب
 شعر بنا دیا ہے ”چور بنے“ کا ٹکڑا بہت پرکھٹا ہے نیچے :-
 وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق لے خضر
 نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لئے
 - امتحان ”کافہ ذوق“ کے ہاں دیکھئے ذہن کی رسائی یہاں تک
 ہے -

وہ مول لیتے ہیں جہدم کوئی نئی تلوار
 لگاتے پہلے تم بھی پر ہیں امتحاں کے لئے
 مومن کا اسلوب بیان قابلِ دید ہے -
 تجھلا ہوا کہ وفا آزمائتم سے ہوئے ہمیں بھی دینی تھی جاں انکے امتحان کیلئے
 غالب کا مضمون اور انداز بیان غالب ہی کا حصہ ہے -
 فلک نہ دور رکھ اس سے مجھے کہ میں ہی نہیں
 دراز دستی قاتل کے امتحاں کے لئے
 ”جہاں“ کا قافیہ ”ذوق“ نظم فرماتے ہیں :-
 بنایا آدمی کو ذوق ایک جزوِ ضعیف
 اور اس ضعیف سے کُل کام دو جہاں کیلئے
 خالص مباحی گری ہے -
 مومن کی وارفتگی ملاحظہ ہو - خوب کہا ہے -
 جنونِ عشق ازل کیوں نہ خاک اڑاں کہ ہم جہاں میں آئے ہیں ویرانی جہاں کے لئے

غالب کی جو بات ہے نرالی ہے رشک کے عجیب عجیب مضمون
 لکھے ہیں کہ اکثر شاعروں کا تصور بھی وہاں تک نہ پہنچا ان ہی حجابات
 میں سے ایک عجوبہ روزگار یہ بھی ہے۔

رہا بلا میں بھی میں مبتلائے آفت رشک
 بلائے جاں ہے ادائیری اک جہاں کے لئے
 تینوں کے ہم قافیہ اشعار یہی تھے ان سے تینوں کی ذہنیت
 کا اندازہ ہو سکتا ہے اب دو دو کا مقابلہ دیکھئے بعض قافیئے۔ غالب
 و مومن کے یہاں ہیں۔ ذوق کے ہاں نہیں بعض قافیئے مومن اور
 ذوق نے لکھے ہیں غالب نے نہیں لکھے "مرگ ناگہاں کا بہانہ ذوق و
 مومن دونوں نے تلاش کیا ہے ذوق نے صرف سامنے پڑی ہوئی چیز
 اٹھالی ہے مومن نے اپنے سحر سے اس کو گلہ مستہ بنا دیا ہے ذوق لکھتے
 ہیں :-

اشارہ چشم کا تیری یکایک اے فتائل
 ہوا بہانہ میری مرگ ناگہاں کے لئے
 مومن کا شعر ہے :-

وہاں تھی شب غم سکون جاں کے لئے
 سخن بہانہ ہوا مرگ ناگہاں کے لئے
 "فتاں" کا قافیہ دیکھئے ذوق :-

شمال نے ہے مراجب تلک کہ دم میں دم فتاں ہے میرے لئے اور میں فتائل کے لئے

”دم میں دم“ کو ایک مرتبہ پھر پڑھ کر دیکھ لیجئے دم تھکا ہوا معلوم ہوتا ہے
بوسن کہتے ہیں :-

حجاب چرخ بلا سے ہوا کرے قیاب
فغاں اثر کے لئے اور اثر فغاں کے لئے
غالب دوسن کے یہاں ایک قافیہ پاساں کا مشترک ہے دوسن کے مشترک
بہنے جائیں تو یہ ایک تیز نشتر یہ ہے جس کی تعریف نہیں ہو سکتی فرماتے ہیں :-
ہے اعتماد مرے بخت حقتہ پر کیا کیا
وگر نہ خواب کہاں چشم پاساں کے لئے
غالب نے بھی جو معنویں نکالا ہے اور جس انداز سے لکھا ہے اس کے
زے دل ہی لیتا ہے نباں قلم قاصر ہے -

گدا سمجھ کے وہ چپ سٹھامری جو شامت آئے
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاساں کے لئے
(حجاب حاضریں قادری کی تنقید ختم ہوئی)

حضرت جوش ملیح آبادی نے صفحہ ۳۸ و ۳۹ پر تحریر فرمایا ہے :-
”اہل سخن اور تہجد نگار اس نئی نکتہ سے بخوبی واقف ہیں کہ غزل گوئی کا
موادہ کرنے کے لئے ہم طرح غزلیات کی ضرورت ہوتی ہے مگر اس سوجھ
کے سوجھ، ایک غزل کے ایک ہی زمین کی غزلیات دونوں کے دیوان
میں موجود نہیں وہ زمین جس میں دونوں کی غزلیات اہل نعر کے
ساتھ ہیں یہ ہے۔“

بنا ہے عیشِ نخلِ حسینِ خاں کے لئے

جوشِ صاحب کے یا تو دیوانِ ذوقِ ملاحظہ و مطالعہ فرمانے کی کوشش
نہیں کی یا دیدہ و دانستہ غالب کی اہمیت کو کم کرنے کے لئے حقیقت سے
چشم پوشی کی ہے ورنہ دیوانِ ذوق میں کئی ایسی غزلیں ہیں جو غالب کی غزلوں
کی ہوزن۔ یا ہم قافیہ یا ہم ردیف ہیں۔
ہوزن۔ ہم قافیہ اور ہم ردیف غزل۔

غالب

نکلا آنکھ سے تیری اک آنسو اس جہاں
کیا سینے میں تجاں کو چکاں شرکان سوزن کا
نشتادوں کو تو کب آنکھوں بے خبر سونا
بہا کھکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں نرن کا
شہادت تھی مری قسمت میں دی گئی یہ چھو کہ
جہاں تلوار کو دیکھا جھکا دیتا تھا گردن کو

ذوق

یہاں تک لاغری ہو اس ترے بیمار کے تن کو
عجب کیا ہو جو مجھے طوق گردن چشم سوزن کو
زیادہ ہوتا ہی پیری میں فرہ نفس اتارہ
یہ بالوں کی سفیدی شیر ہے اس مار و نرن کو
کس نام و شہرت پہنچ لاتی ہو عدم سے بھی
پٹ کر مثل طوقِ فاخہ معنفا کی گردن کو

ابھی ہم قتل گہ کا دیکھنا آساں سمجھتے ہیں
نہیں دیکھا شناسا اور تھو خوں میں پیر تو سن کو
ہوا چرچا جو پیر پاؤں کی زنجیر بننے کا
کیا بیتاب کاں میں جنبش جو ہر گے آہن کو

غالب
خوشی کیا کھیت پر پیر اگر سو بار بار آئے
بھٹتا ہوں کہ ڈھونڈھے ہو ابھی سی برق خرم
سخن کیا کہ نہیں سکنے کہ چریا ہوں جواب کے
جلکہ کیا ہم نہیں رکھتے کہ کھو دیں جا سکتے کو

ہوزن۔ ہم قافیہ اور ہم دین غزل ۲

میں اور حق وصل خدا و بات ہے
جاں دینی نذر بھول گیا اضطراب میں
قاصد کتے تے تے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں چہرہ لکھیں گے جواب میں

خط پڑھ کے اور بھی وہ ہوا پیچ و تاب میں
کیا جانیں لکھو یا اُسے کیا اضطراب میں
یہ لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں
واں ایک خاشا تری سب کے جواب میں
بے بادہ عورگی میں ہوا ذوق جو موہن
کی تو بہ بے وقوف نے ناحق شباب میں

تا پھر نہ استعار میں نیند آئے علم بھر
آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں
مجھ تک کب ان کی نرم میں آتا تھا دو چرا
ساتھی نے کچھ ملانہ دیا ہو شراب میں
جو منکر و فائدہ ہو فریب اس بے کیا چلے
کیوں بدگیاں ہوں دوست کے دشمن کی ہانپا
تیوری چڑھی ہوئی جواند ز نقاب کے
چہ اک شکن پڑی ہوئی طرف نقاب میں
لاکھوں نگاہ ایک چڑا نا نگاہ کا
لاکھوں بنا کا ایک بگڑا نا حساب میں

ہیں آج کیوں دلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں
رو میں سے خوش عمر کہاں دیکھے تھے
نئے ہاتھ پاگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں
ہے مثل نمود صور پر وجود جب
یاں کیا دھرا ہے قطرہ موج دھاب ہیں

ہم وزن - ہم قافیہ - ہم ردیف غزل ۳

پلا دے ادک سے ساتی جو ہم کو نفرت ہے
پیالہ گر نہیں و تیانہ دے شراب تو دے
وہ آکے خواب میں تسکین غم شراب تو دے
وے مجھے پیش دل مجال خواب تو دے
کمرے ہے قتل لگاؤٹ میں تیرا رو دینا
تری طرح کوئی تیغ نگہ کو آب تو دے
دکھلے حبش لب بھی تمام کر قسم کو
دے جو بوسہ تو سہ سے کہیں جواب تو دے
استد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اس نے میرے ہاتھ پاؤں اُتے دے

کہاں تک کہوں ساتی کہ لا شراب تو دے
نہ دے شراب ڈبو کر کوئی کہاں تو دے
کھلے جنازے گلشن میں غنچہ نرس
ذرا دکھا تو اسے چشم نیم خواب تو دے
گزر لے لگے یہ مرے سر سے اتنا آگ تو دے
کہ نہ پر چرخ بھی دکھلائی جوں جہاں تو دے
جواب نامہ نہیں گرتو رکھو نامہ یا
جو چھپیں قبر میں عاشق سے کچھ جواب تو دے
خٹک دلوں کی اگر مشیت خاک و دوح میں
بڑے تو دہی اک بار آگ داب تو دے

یہ ہم جو بحر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں
کبھی صبا کو کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں

ہم اپنے خدیوے دل کے اثر کو دیکھتے ہیں
وہ پہلے بزم میں دیکھیں کدھر کو دیکھتے ہیں

فراق کو جو ہری صراف زر کو دیکھتے ہیں
بشر کو دیکھتے والے بشر کو دیکھتے ہیں
وہ بزرگ کو گزرتا ہے جیسے عید کا دن
کبھی جو شکل تنہا ہی سحر کو دیکھتے ہیں
بنا کے بہینہ دیکھے ہے پہلے آئینہ گر
ہنر و دانہ بھی عیب و ہنر کو دیکھتے ہیں

غالب
وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں
نظر لگے نہ کہیں ان کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں میرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں
تو بے جواہر طرف کلا کو کسا دیکھیں
ہم اس کے طالع لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

ان دونوں اہل کمال کے اشعار کے مطالعہ سے معلوم ہو گا کہ :-
غالب کے اشعار میں معنی آفرینی - نزاکت خیال - تصوف - شری - غم -
اخلاق - بلند خیال سب کچھ موجود ہے لیکن ذوق کے اشعار میں یہ خوبیاں
بہت کم ہیں نہ تو وہ زور بیان ہے نہ وہ سلاست ہے اور نہ وہ وجدانی
کیفیت ہے جو غالب کے یہاں موجود ہے غالب کے اشعار ذوق کے اشعار
سے بہت بلند و ارفع ہیں ان کا مقابلہ ہو ہی نہیں سکتا۔ ان اشعار کی تقویت
کا یہ عالم ہے کہ خواص تو خواص عوام بھی مجلسوں میں پڑھ کر ان اشعار کے مزے
لیتے ہیں اور ذوق کے اشعار میں سے کسی ایک کو کبھی خاص موقعوں پر پڑھنے
ہوتے نہیں سنا گیا۔ اسی طرح غالب کی دوسری غزلوں کا ذوق کی غزلوں سے
مقابلہ کیا جائے تو غالب کی غزلوں کا پایہ بہت بلند ہے۔ ذوق - غالب
کے خیالات کی رفعتوں نہیں پہنچ سکتے اور ذوق ہی پر کیا منحصر ہے ان کے پہلے
جتنے شاعر بھی ہوئے علو تخیل میں غالب سے اونچے نظر آتے ہیں۔

حضرت جوش نے مرزا کے کلام کی تعریف کرتے ہوئے اپنی شرح کے صفحہ ۴۹ پر لکھا ہے۔

غالب کی وفات سے تیس سال بعد یعنی بیسویں صدی کے شروع میں ان کے کلام کی مقبولیت اور شہرت بہت زیادہ ہونے لگی۔ اس کی بڑی وجہ ان کی فلسفیانہ شاعری تھی فلسفہ، عشق و محبت کے مضامین و گریہ مرزا سے پہلے بھی شرا کے کلام میں کہیں کہیں نظر آ جاتے ہیں مگر اس قدر جس قدر آٹے میں نمک۔ یہ مضامین مرزا ہی کی شاعری کا خاص میدان کہے جاتے ہیں مرزا کے دیوان کا پہلا مطلع بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے چونکہ اعلیٰ تعلیم زیادہ پھیل جاتے سے تعلیم یافتہ لوگ فلسفیانہ خیالات کے دلدارہ ہو رہے تھے اور اس قسم کی شاعری کسی اور کے کلام میں نظر نہیں آتی تھی اس لئے کلام غالب کی مقبولیت کے ساتھ ساتھ بہت سے شعرا نے بھی اسی رنگ میں کہنا شروع کر دیا اور ان کی اس کوشش کو بھی قابل تندرسمبھا گیا نتیجہ یہ ہوا کہ اس قسم کی شاعری تمام دنیائے اردو پر چھا گئی اور قدیم طرز کی شاعری فنکاروں سے گرتی گئی یہ اثر دہلی اسکول آف لٹریچر کی محدود رہا بلکہ لکھنؤ اسکول بھی اس سے اثر پذیر ہوا نیز ہر قسم کی پیردی کرنے والوں میں حالی، اقبال، اکبر، بیگم

کا نام بھا جاسکتا ہے۔

صفحہ ۵۶ پر لکھتے ہیں۔

” مرزا غالب شاعری کو قافیہ پیمانی نہیں بلکہ معنی آفرینی سمجھتے تھے
 سلمیٰ شاعری سے انہیں نفرت تھی اس لئے نئے نئے مضمون، نئے
 نئے خیال، نئے اسلوب، بندش، نئے نئے انداز بیان ان کے کلام
 میں جا بجا پائے جاتے ہیں۔“

مرزا کی شوخی طبع، رنگ و خم کے مضامین میں بھی شوخ بیانی سے نکلتی
 تھی۔“

مذکورہ بالا مطبوعہ پڑھنے کے بعد ناظرین خود ہی اندازہ لگا سکتے ہیں
 کہ ذوق اور غالب کا موازنہ کرتے وقت کتنی بے انصافی سے کام لیا ہے۔

مولانا طباطبائی کی شرح دیوان غالب

مولانا طباطبائی نے جو دیوان غالب کی شرح لکھی ہے اس میں
 کئی نقائص ہیں۔

(۱) اکثر اشعار کا مطلب اور تشریح وہ پوری طرح نہیں کرتے بلکہ
 اتنا مختصر لکھتے ہیں کہ اس عبارت کی تشریح کی پھر ضرورت پڑتی ہے۔

(۲) اکثر اشعار کا مطلب وہ دوسرے شاعرین سے محض بیان کرتے
 ہیں اور اس شعر کے بالکل نئے معنی لکھتے ہیں حالانکہ دوسرے شاعرین
 اس شعر کے مطلب میں متفق البیان ہوتے ہیں۔

(۳) غالب کے اشعار میں اصلاح فرماتے ہیں علم عروض اور قواعد عروض
 نحو کی غلطیاں نکالتے ہیں اور غیر متعلق باتیں بہت لکھتے ہیں۔

(۴) غالب کے بعض اشعار کو بالکل بے معنی اور ٹھیکل سمجھتے ہیں۔
ان چاروں باتوں کے متعلق ہم ان کی شرح دیوان غالب سے
مثالیں پیش کرتے ہیں۔

۱۔ غالب کی مشہور غزل کے چند اشعار کی تشریح ملاحظہ فرمائیے جو ہم
بلا کم و کاست نقل کرتے ہیں۔

(۱) کوئی اُمیدِ بربط نہیں آتی کوئی صورتِ نظر نہیں آتی
تشریح :- یعنی حصول اُمید کی صورت۔

(۲) آگے آتی تھی حالِ دلِ پینہی اب کسی بات پر نہیں آتی
تشریح :- یہ وہ شعر ہے کہ تمیر کو بھی جس پر رشک کرنا چاہئے افسردہ
خاطر کو کس عنوان سے بیان کیا ہے۔

(۳) جانتا ہوں ثوابِ طاعتِ زہد پر طبعیتِ ادھر نہیں آتی
تشریح :- طاعت و زہد کا محض جان لینا کافی نہیں جب تک کہ توفیق
ہوا دھرے۔

(۴) داغِ دل گر نظر نہیں آتا بوجھِ اسے چارہ گر نہیں آتی
تشریح :- دوسرے مصرع میں استفہام انکاری ہے اور چارہ گر
کی نا فہمی پر تشبیہ ہے۔

(۵) مرتے ہیں آرزو میں مرے کی موت آتی ہے پر نہیں آتی
تشریح :- پہلا مرنا مجاز ہے کثرتِ شوق کے معنی پر اور دوسرا مرنا معنی
حقیقی پر ہے۔

دوسری غزل

(۶) جو رے باز آئے پر باز آئیں کیا
کہتے ہیں ہم تجھ کو منہ دکھائیں کیا
یعنی آپ شرمندگی سے منہ نہیں دکھاتے یہ بھی میرے لئے ستم ہے۔

(۷) رات دن گردش میں ہیں مثلِ سماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبراہٹیں کیا
تشریح :- توکل کی طرف اشارہ ہے۔

(۸) لاگ ہو تو اس کو ہم تجھیں لگاؤ
جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا
تشریح :- یعنی وہ عداوت کرتا تو ہم لگاؤٹ سمجھتے۔

(۹) ہوئے کیوں نامہ پر کے ساتھ تھے
یارب اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا
تشریح :- یارب اس شخس میں نیرا کے لئے نہیں اظہارِ تعجب کے لئے ہے۔

(۱۰) موجِ خوں سر سے گز رہی کیوں جا
آستانِ یار سے اٹھ جائیں کیا
تشریح :- کیا دوسرے مصرع میں تحقیر کے لئے۔

اسی طرح آپ کو طباطبائی کی شرح میں اکثر اشعار کی شرح اتنی ہی مختصر ملے گی۔

(۲) اکثر اشعار کا مطلب وہ دوسرے شاعرین سے مختلف لکھتے ہیں حالانکہ شاعرین ان کے مطلب میں متفق ہوتے ہیں چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

(۱)

دل میں زوق وصل یاد پار تک باقی نہیں
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو ٹھکھا جل گیا

دہا، عشق کے اس مقام کی طرف اشارہ ہے جب اُمید و یاس وصل و بچر، یاد محبوب غرضیکہ کسی جذبہ کا احساس باقی نہیں رہتا اور یہ وہ مقام حیرت و عالم فراموشی ہے کہ اس کے بعد انا المحبوب اور انا المحب کی کیفیت ظاہر ہوتی ہے۔

باقی۔ عشق کے آغاز میں میرے خاندل میں مردقت پار کی یاد اور شوق وصل کے خیالات موجزن رہتے تھے لیکن عشق کی آگ نے بھڑک کر خاندل اس طرح پھونک ڈالا کہ اب نہ تو ذوق وصل باقی ہے اور نہ یاد دوست انسان کی فطرت ہے کہ جب وہ انتہا نہ چہ مایوس اور نا اُمید ہو جاتا ہے تو کوئی اُمید باقی نہیں رہتی۔

طباطبائی۔ یعنی رُسک کی آگ ایسی تھی کہ معشوق کو دل سے بھلا دیا۔ اور اس کا بغیر سے ملنا دیکھ کر ذوق وصل جاتا رہا۔ گھر سے دل آگ سے رُسک رقیب مراد ہے۔

نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا
 قیامت ہے شرک آلودہ ہوتا تیری مڑگاں کا
 (باقر) خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ تیری آنکھوں میں آنسو ڈھرانے سے
 کتنے عشاق کا لہو پانی ہو کر آنکھوں کے راستے بہ گیا ہوگا یعنی انہیں کس قدر
 تکلیف پہنچی ہوگی۔ تیری آنکھوں میں آنسو آ جانا تیرے چاہنے والوں کے
 لئے قیامت سے کم نہیں۔

(سعید) تیرے غم میں معلوم نہیں کتنے حیران نصیبوں کا خون جگر
 آنسو بن کر آنکھ کے راستے نکلا ہوگا تب کہیں تیری آنکھیں۔ شرک آلود
 ہوتی ہیں۔

(بچو) کس کس عاشق کا لہو پانی کی طرح تونے بہایا ہوگا۔ اب ان
 بے گناہوں کی یاد تجھ کو رلا رہی ہے۔

(طبا طبائی) مڑگان معشوق جو ہمیشہ عشاق کے دل و جگر میں کھٹکاتے
 ہیں اس کا آنسو وہی آنسو ہے جو عشاق کے دل میں پیدا ہو کر آنکھوں کی پٹ
 جانا جاتے ہیں اور تیری مڑہ پر آنسو ہونا اس کی علامت ہے کہ عشاق کا
 لہو پانی ایک ہو گیا۔

(حسرت) تیری جفا سے کس کا لہو پانی ہوا ہوگا جس کی مذمت کے
 باعث تیری آنکھیں شرک آلود ہیں۔

اسی طرح مثال میں بہت سے اشعار پیش کئے جاسکتے ہیں جو

طوالت کے خوف سے نظر انداز کئے جاتے ہیں۔
(۳) شرکی تشریح میں غیر متعلق باتیں بہت لکھتے ہیں۔ مثلاً :-

(۱)

غالب اپنا یہ عقیدہ قبولِ تاسخ آپ بے بہرہ سے جو معتقد تھے نہیں
طباطبائی صاحب نے اس شرکی کوئی تشریح نہیں کی :- مطلب لکھا
بلکہ سارا زور اس بات پر صرف کیا ہے کہ غالب اور میر کو غیر دہلوی ثابت
کیا جائے ان کے چند ایسے الفاظ مثال کے طور پر پیش کئے ہیں جو دہلی میں
نہیں بولے جاتے۔ اس کے بعد میر اور متودا کا موازنہ کیا ہے جس کی قطعاً
ضرورت نہیں تھی اس طرح ادھر ادھر کی باتوں میں تقریباً ۱۴ صفحہ بھر دیے
ہیں پھر شرکی تشریح اسی طرح تشنہ رہی۔

(۲)

کرتے کسی منہ سے ہو غزبت کی شکایت غالب
تم کہ بے مہری یا مانِ وطن یاد نہیں
اس شرکی تشریح یا مطلب کے بجائے طباطبائی صاحب نے ۱۱ صفحہ صرف
گزمر و صرف نحو پر صرف کیا ہے مثال کے طور پر ہم اس ۱۱ صفحہ میں چند
لامنیں بطور نمونہ آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں :-

اود غزور و کے حقائق میں سے ایک یہ مسئلہ ہے کہ دتم کو یہاں
ترکیب میں کیا ہے اود دیا د کیا ہے اور اگر کہیں کہ د نہیں، فعل
ناقص ہے ام اس کا بے مہری یا مانِ وطن ہے اور خیر اس کی یاد

ہے تو اس صورت میں (تم کو) مفعول نہیں کہہ سکتے اس لئے کہ فعل
 ناقص لازم ہوا کرتا ہے اور اگر یوں کہیں کہ نہیں اس مقام میں
 تاتا ہے اور بے مہر یا ران وطن فاعل اور متمکون مفعول ہے تو
 اس صورت میں دیا (تو کیب میں کیا ہے) اور نہیں تاتا ہوا متمکون
 کیوں ہو گیا اور یہ دونوں اشکال اس طرح دفع ہو سکتے ہیں کہ یوں کہیں
 کہ پہلی صورت میں (تم کو) ہم مفعول یہ نہیں کہہ سکتے بلکہ متعلق فعل
 ہے۔ اس لئے (کو) مفعول بہ کے لئے خاص نہیں ہے مفعول لا کے
 لئے بھی ہوتا ہے جیسے کہتے ہیں حج کو گئے اور مفعول فیہ کے لئے بھی
 آتا ہے جیسے کہتے ہیں مشکل کو روانہ ہوئے حرن کے معنی میں بھی آتا
 ہے جیسے پوچھتے ہیں قافلہ کدھر گیا۔
 بس اسی قسم کی باتوں میں، پانچو لکھ دیا ہے۔

(۳)

شکیں لباس کعبہ علی کے قدم سے جان
 ناف زمین ہے نہ کہ ناف غزال ہے
 اس شعر کا مطلب عرف اس قدر ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ
 کعبہ میں پیدا ہوئے تھے حضرت غالب فرماتے ہیں کہ خانہ کعبہ کے سیاہ
 اور خوشبو دار غلاف کو حضرت علی کے قدم کی وجہ سے شکیں سمجھنا
 چاہئے۔ وہ نہ کعبہ کے متعلق یہ تو مشہور ہے کہ وہ ناف زمین زمین کا
 وسط ہے یہ مشہور نہیں ہے کہ وہ ناف غزال بھی ہے۔

طباطبائی صاحب فرماتے ہیں :-
 جان، اس شعر میں بدان کا ترجمہ ہے یا علم کا زمین ترکیب اضافی
 ہے فارسی میں ہے اور اعلان نون کے ساتھ ہی حالانکہ نحو فارسی
 کے یہ خلاف ہے اس لئے کہ جب زمین میں اعلان نون کیا تو وہ ہند کا
 لفظ ہو گیا پھر اس کی طرف اضافت فارسی کیونکر صحیح ہوگی جیسے سودا کا
 یہ مصرع :-

تن پر اگر زباں ہو بجائے ہر ایک مور
 کہ اس میں ترکیب فارسی میں ایک لفظ آگیا ہے اور ایک ہند ہے یک کا
 کعبہ کو ذات زمین کہنا حدیث کا مضمون ہے اور ذات زمین سے وسط زمین
 مراد ہے لیکن اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ وسط زمین کب سے خط استوا
 سے کیسے درجہ اور کئی دقیقہ شمال میں مٹا ہوا ہے اس کا جواب یہ ممکن ہے کہ
 قول تو ایسی حدیثیں بہت کم ہیں جن کا قطعی صدور ہونا اور محفوظ المثنیٰ
 ہونا ثابت ہو اور ان لینے کے بعد دیکھو اہل یورپ نے خاک چھان کر
 جو تاریخی حالات تحقیق کئے ہیں ان میں سے یہ امر بھی حیرت خیز ہے کہ
 اقصائے شمال میں جہاں برف اور سردی انتہا کی ہے بہ کثرت ایسے
 جانوروں کی ہڈیاں ملتی ہیں جو گرم ملکوں کے رہنے والے ہیں اور کبھی منطقہ
 حارہ سے باہر وہ کو زندہ نہیں رہ سکتے یہ امر بڑا قرینہ ہے اس بات کا کہ
 کسی زمانے میں یہ ملک منطقہ حارہ کے نیچے تھے اور جہاں برف پڑا کرتی
 ہے وہاں لو چلا کرتی ہے۔ اس سے یہ امر بخوبی نکلا کہ جب اقصائے

شمال منطقہ حارہ میں تھا تو عرب کا ملک ضرور خط استوا پر ہوگا۔

(۴) متاثرہ کروں ہوں رہ وادی نیل
 تا بازگشت سے نہ رہے مدعا مجھے
 یعنی چاہتا ہوں کہ اپنے خیال میں ایسا غرق ہوں کہ پھر آہ نہ پھر سکوں۔
 اب کروں ہوں۔ پر جو بحث کی ہے اور اس کو غیر فصیح ثابت کیا ہے
 اس میں ۳۰ صفحے بالکل غیر متعلق باتوں سے پھر دیئے ہیں اور اپڑھ کر بظن
 اٹھا بیٹے۔

(۵) لکھتے رہے جنوں کی حکایات خونچکاں
 ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے
 کسی امر کی سزا میں ہاتھ قلم ہونا یہ مضمون دوسرے مصرع کا ہے پہلے
 مصرع میں شاعر کے ذمہ یہ بات ہے کہ اسے بیان کرے جس کے سبب ہاتھ
 قلم ہوئے ایسی باتیں بہت سی ہو سکتی ہیں جس کے سبب سے ہاتھ قلم ہوں
 "مرتا ہوں اس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر"
 اس شعر کی شرح اسی روایت میں دیکھو۔

اس کے بعد گرامر اور ظلم عروض کی غیر دلچسپ بحث چھیڑی ہے اور
 غیر متعلق باتوں پر ساڑھے پانچ صفحے صرف کئے ہیں اور بتایا ہے کہ :-
 غالب کے پہلے مصرع سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کس وجہ سے ہاتھ
 قلم ہوئے۔

خود ہی مصرع پر ۷۷ اگر ہیں لگا کر ظاہر کیا ہے کہ یہ اس طرح بھی

ہو سکتا تھا۔ پھر اسی ضمن میں ۔

اس لئے تصویر جاناں ہم نے کچھائی نہیں
پر اکینا گرہیں لگائی ہیں اور اپنی شاعری کے کمال کو ظاہر کیا ہے حالانکہ
ان سب باتوں کی اس شعر کی تشریح کے سلسلہ میں قطعاً ضرورت نہ تھی
آپ بھی ان صفحات کو پڑھ کر مٹھ اٹھائیے ۔

حضرت غالب کے کلام میں اصلاح فرماتے ہیں ۔

پیش آپڑی وعدہ دلدار کی

وہ آئے یا نہ آئے پریاں انتظار ہے

تشریح : پیش آپڑی نے سے یہاں مراد بات کا نہا ہنا جس کے خلاف
میں شہادت کا اندیشہ ہو کہتے ہیں اس نے آنے کا وعدہ کیا تو مجھے انتظار
کرنا ضرور ہے گو وہ وعدہ خلاف ہے لیکن میں انتظار نہ کروں تو میرے
وعدے کو چھوٹا سمجھا ۔ مگر کے معنی پر (پ) سے فصیح ہے اور یاں سے
یہاں بہتر ہے یعنی دو مرا مصرع یوں ہوتا ۔ ع

” وہ آئے یا نہ آئے یہاں انتظار ہے “

تو اس میں (پریاں کے محل جانے سے بندش اچھی ہو جاتی ۔ اور یہ کا حذف
کرنا محاورہ میں بہت ہے کچھ معافی میں غلط بھی نہ لگتا ۔ مگر یہ پوچھو تو ایسی
ذرا ذرا سی باتوں کا کوئی بھی خیال نہیں رکھتا عود ہندی میں کچھ کا لفظ
مصنعت کی زبان پر بتدکیر ہے مگر اس شعر میں بتا نیت ہے غالباً سبب
ہوا پہلے یہ دیوان لکھنؤ میں تھا وہاں کاتب نے صرف کر دیا اور پھر مصنف

نے بھی یوں ہی رہنے دیا۔ سہرے میں بھی اکثر جگہ اصلاح فرمانے کی کوشش
ہے حضرت غالب کے اکثر اشعار کو مہمل قرار دیتے ہیں۔

(۳) صفحہ ۲۶۸۔

آم سیلاب طوفانِ صدامے آب ہے
نقش پا جو کان میں رکھنا ہے انگلی جاوہ ہے
باقر: نقش پا کو صورت کان سے اور جاوہ کو دنگھڑ ندی (انگلی
سے مشابہت ہے۔

طوفان آب کی آواز آدمی ہے اسے سن کر نقش پا نے اپنے کان
میں جاوہ دنگھڑ ندی کی انگلی رکھ لی ہے تاکہ طوفان آب سے وہ خوفزدہ
نہ ہو خوف پیدا ہونے کا سبب یہ ہے کہ طوفان آگے کا تو نقش میٹ
جائے گا۔

لیکن طباطبائی صاحب فرماتے ہیں۔ سچ پوچھو تو یہ شعر معنی ہے
اور اس سبب سے مخرج سے مستثنیٰ ہے پھر تقریباً اصفیٰ میں اس کی عروضا
مطبیعوں پر بحث کی ہے۔

(۱) نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ خسری کا
کاغذی ہے پیرہن ہر سیکر تصویر کا
مرزا غالب نے اس شعر کی شرح خود ایک خط میں فرمائی ہے۔
"ایران میں دم ہے کہ دادخواہ (فریادی) کاغذ کے کپڑے پہن کر حکم

کے سامنے جاتا ہے جیسے شعل وں کو جلد ناخون آلود کپڑا بانس پر لٹکا کر
لے جانا بس شاعر خیال کرتا ہے کہ نقش کس کی شوخی تحریر کا فریادی
ہے جو صورت تحریر ہے اس کا پیرہن کاغذی ہے مٹی اگرچہ مثل تصاویر
افتبار محض ہو موجب رنج و غل ہے۔ (عود ہندی)

سجید، آسی، سہا، بخود، یہ سب اس شعر کو بامعنی قرار دیتے ہیں
لیکن طباطبائی اس شعر کو بے معنی کہتے ہیں۔

(۲)

میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا
میری آہ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا
شعر کا مفہوم یہ ہے کہ اے غافل میں عدم کے مقام سے آگے
محل گیا ہوں ورنہ جب میرا مقام عدم تھا تو جب بھی وہاں میں نے آہ
آتشیں کھینچی اس کی آگ سے عنقا کے پر جل گئے شعر میں خوبی یہ ہے کہ
عنقا ایک معدوم پرندہ ہے گویا وہ مقام عدم رکھتا ہے شاعر کہتا ہے
کہ جب میں اس مقام میں تھا تو میری آہ آتشیں سے عنقا کے پر جل جاتے تھے
یعنی فنا فی عدم ہونے پر بھی میری آہ میں اس قدر گرمی تھی۔ بقول حسرت
اپنی ہستی کے بیان میں مبالغہ کیا ہے۔

باقر، سہا، حسرت، اور بے خود تو اسے بامعنی سمجھتے ہیں لیکن
طباطبائی اسے بے معانی سمجھتے ہیں۔

انتخاب کلام مومن پر تنقید

شگم کتاب گھر نے انتخاب کلام مومن شائع کیا ہے جس کو عبدالودود خاں صاحب نے مرتب کیا ہے اگر وہ مومن کی تعریف میں قصیدہ خوانی کرتے تو ہمیں بالکل اعتراض نہ تھا اس لئے کہ مومن ایک بڑے اعلیٰ درجہ کے حکیم، ایک حق شناس آدمی بہت بڑے منجم اور اعلیٰ پایہ کے شاعر تھے ان کی خوبیوں کا زمانہ معترف ہے اور ہم بھی اپنا سر عقیدت ان کے سامنے خم کرتے ہیں لیکن عبدالودود صاحب نے بعض واقعات لکھ کر ان کی تعریف نہیں کی بلکہ ان کی توہین کی ہے اور ان کے کیر کمر کو ان کے عقیدت مندوں کی نظروں میں گرا دیا ہے۔

ایک طرف تو وہ لکھتے ہیں :-

مومن سوائے خدا کے کسی پر بھروسہ نہیں کرنے تھے اپنی مصیبت کا حال خدا سے بیان کر کے اس سے امداد کے طالب ہوتے تھے یہی مومن کی خدا پرستی اور مذہب پرستی تھی کہ جس نے ان کو در بدر کا سہ لیں ہونے سے بچا یا نہ صرف کا سہ لیں ہونے سے بچا یا بلکہ انھیں حضرت سید احمد شہیدؒ بلویہ کا معتقد اور مرید کر دیا پھر پھیل اسی بارگاہ کا معتقد اور مرید کسی صاحب ثروت کے آگے کس طرح سر جھکاتا مومن کو یہ شرف صرف حضرت سید احمد شہیدؒ سے ہی نہیں بلکہ مومن کی مجلسی زندگی کا زیادہ حصہ جو اپنے گھر

کے مذہبی ماحول میں بسر ہوا اس نے ان پر اثر ڈالا اور حضرت شاد
عبدالعزیز محدث دہلوی کی مجالس اور تعلیم نے اس کو پختہ کر دیا
صرف یہی نہیں بلکہ مومن نے جگہ جگہ غزلیات میں بھی مذہب کو شامل
کیا ہے اور ہمیشہ جہاد کے متمنی رہے گو کہ ان کی یہ آرزو پوری نہیں
ہوئی۔

گویا مومن کو عبدالودود صاحب نے ایک مجتہد، زبردست مذہبی
آدمی، مجاہد، خدا پر بھروسہ رکھنے والا اور بڑے بڑے بزرگوں کی صحبت
سے فیض حاصل کرنے والا دکھایا ہے بلکہ حضرت سید احمد شہید بریلوی اور حضرت
عبدالعزیز محدث دہلوی کا مرید اور حقیقت ثابت کیا ہے۔
دوسری جگہ انھوں نے ایک خانگی عورت مسماۃ امت الفاطمہ سلیم
سے عشق باری کے حالات بھی لکھے ہیں۔

ایک عورت مسماۃ امت الفاطمہ سلیم جس کو صاحب بھی کہتے ہیں دریا
شاہ جہاں آباد کے مومن خاں سے ملاقات اس کی تبریب علاج
کے ہوئی تھی تاہم ایک آشنائی سی کئی سال گزرے کہ وہ لکھنؤ
چلی گئی۔ وہ ایک خانگی تھی شہزی توں عین مومن کی اسی محبوبہ کے عشق
میں ہے اسباب فیض صحبت مومن خاں وہ بھی شعر کہنے لگی تھی۔ لیکن
اگر مومن نے عشق کیا تو کیا غضب کیا۔ وہ بے ظفر کے اس بغداد میں عشق
و عاشقی لازم و ملزوم ہو کر رہ گئے تھے اور مومن نے اسی شہر اور اس
کے ماحول میں پرورش پائی تھی پھر وہ اس سے کس طرح الگ رہتے

اُن کے کلام میں اس عشق کا رنگ بتاتا ہے

دلی سے رام پور میں لایا خونِ عشق

ویرانہ چھوڑ آئے ہیں ویرانہ تر میں ہم

یہ تو حکیم سوسن خاں کی تعریف نہ ہوئی۔ یہ تو ان کی کھلی ہرئی توہین ہے ایسا مذہبی اور مشتقی انسان گرا تو ایسا گرا کہ ایک خانگی عشق میں مارا مارا پھردھا ہے یا تو یہ خانگی کا واقعہ غلط ہے اگر واقعہ صحیح ہے تو وہ کوئی اور سوسن ہوں گے۔ جو عارف باللہ بہت بڑے مذہبی اور خدا پرست انسان تھے قبل ایک مذہبی آدمی کو ان باتوں سے کیا واسطہ۔

اسی طرح عبدالودود صاحب نے غالب کو کاسہ امیس۔ شرابی۔ امراء کی شان میں قصیدہ گو شاہ ظفر کا مدح سرا۔ انگریز حکام کا چاہپوس اور غیر خود وار وغیرہ کہہ کر غالب کے کیریکچر پر حملے کئے ہیں۔

یہ ایک نہایت بیہودہ اور لغو بات ہے کہ ایک ترے ہوئے شخص کے کیریکچر پر اس قسم کے حملے کئے جائیں پھر تو زمانہ ماضی و حال کے کسی شاعر یا بڑے آدمی کی عزت و عصمت محفوظ نہیں رہ سکتی یہ لوگ اپنی کتاب فروخت کرنے کے لئے بیس لٹرو اور بیہودہ باتیں لکھ کر گرم بازار دی کرتے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں کہ وہ اردو ادب کی بہت بڑی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ بیشتر صاحبان کا اولین فرض ہے کہ وہ اس قسم کی کتاب چھاپنے سے گریز کریں۔ یا اس قسم کی لغو باتوں کو نظر ثانی کر کے نکال دیا کریں۔

سہرا

غالب اور ذوق کا موازنہ

اگر دو زبان میں غالب سے پہلے کسی نے سہرا نہیں لکھا۔ وہی سہرے کے موجد ہیں۔ سہرے کی ایجاد کا سہرا انھیں کے سر ہے۔ ولی سے لیکر غالب کے زمانہ تک کسی شاعر کے کلام میں سہرا نظر نہیں آتا۔ ذوق اور دوسرے شاعروں نے جو سہرے لکھے ہیں وہ غالب کی تقلید میں لکھے ہیں۔ ممکن ہے کہ ان شعرا کا کوئی شعرا اچھا ہو لیکن اولیت کا شرف ہمیشہ غالب ہی کو رہے گا۔

غالب نے کئی سہرے لکھے ہیں جو ان کے شاگردوں کی بیاض میں موجود ہیں۔ ان میں سے دو سہرے اس جگہ نقل کئے جاتے ہیں۔

سہرا

ہم تئیں تارے ہیں اور چاند شہاب الدین خاں
بزم شادی ہے فلک کا ہنشاں ہے سہرا

ان کو لڑیاں نہ کہو جس کی سوجھیں سمجھو
 ہے تو کشتی میں ولے بحر رواں ہے سہرا
 (از بیاض نواب علاء الدین احمد خاں غلانی)
 قلمی

سہرا
 برج تک دھوم ہے کس دھوم سے آیا سہرا
 چاند کا دائرہ لے لے نہرا لے لے گیا سہرا
 تمک سے لڑتی ہیں آپس میں اُلجھ کر لڑیاں
 باندھنے کے لئے..... اٹھایا سہرا
 (ال قلعہ کی جھلک (ناصر نذر فراق صفحہ ۳۴)

لیکن غالب کا سب سے زیادہ مشہور سہرا وہی ہے جو انھوں نے
 مرزا جواں نخت کی شادی کے سلسلہ میں لکھا ہے۔
 اس سہرے کی وجہ تصنیف یہ ہے کہ نواب زینت محل بادشاہ
 بیگم کو بادشاہ کے مزاج میں بہت دخل تھا مرزا جواں نخت ان کے
 بیٹے تھے جب مرزا جواں نخت کی شادی کا موقع آیا تو بڑی دھوم دھام
 سے یہ شادی رچانی گئی نواب زینت محل کے ایما سے غالب نے مرزا
 جواں نخت کے لئے سہرا لکھا اور ایک زنگار کا غزیر لکھوا کر اور ایک
 سنہری کشتی میں لگا کر بڑے تکلف کے ساتھ بادشاہ کی خدمت میں
 پیش کیا۔ بادشاہ سہرے کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے لیکن مقطع پر نظر

پڑی تو وہ یہ سمجھے کہ ہمارے استاد ذوق پر چوٹ کی گئی ہے جب ذوق
 حسب معمول ان کے پاس آئے تو بادشاہ نے وہ سہرا ان کو دکھایا اور کہا
 ذرا منقطع بھی دیکھئے اور اس سہرے کا جواب لکھئے۔ ذوق اسی وقت لکھتے
 بیٹھ گئے اور غالب کے سہرے کے جواب میں سہرا لکھا اور بادشاہ کو دکھا
 ارباب نشاط کو بلا کر وہ سہرا یاد کرایا گیا انھوں نے وہ سہرا
 محفلوں میں گا کر سنا یا مرزا کو جب اس واقعہ کی خبر ملی تو انھیں بڑا رنج
 ہوا۔ انھوں نے سوچا کیا تھا اور ہو گیا کچھ آخر کار ایک معذرت لکھ کر
 بادشاہ کی خدمت میں گزرائی کہ طبیعت پر جو مال آگیا ہے وہ رفع ہو گیا
 بادشاہ کا دل اس معذرت سے صاف ہو گیا ذیل میں غالب اور ذوق کے
 سہرے درج کرتے ہیں۔ طباطبائی اور طیبانی صاحب نے ان اشعار کی تشریح
 کر کے جو ذوق کے کلام کو سراہا ہے وہ بھی ملاحظہ فرمائیے کہ کیا ان بزرگوں
 نے سوانح یا تنقید کرتے وقت انصاف سے کام لیا ہے ؟

ذوق کا سہرا

غالب کا سہرا

- (۱) خوش ہوائے بخت کہ آج تیرے سر پہرے اے جواں بخت مبارک تجھے سر پر پہرے
 باندھ شہزادہ جواں بخت کے سر پر پہرے آج ہے بین وسعدت کا نئے سر پہرے
 (۲) کیا ہی اس چاند سے مکھڑے پھبلا لکنا ہو (۱) وہ کہے صلی علیہ کہے سبحان اہم
 ہے ترے حسن و دل افروز کا ترور پہرے دیکھے مکھڑے پر جو تیرے سر پر پہرے
 (۳) ایک کو ایک پتہ نہیں ہے دم آتش ایک کو ایک پتہ نہیں ہے دم آتش
 سر پر دستار ہے دستار کے اوپر پہرے

(۳) سر پہ چڑھنا ہے تجھے پھیلا پیرائے طرف کلاہ (۴) تائے اور بنی میں رہے خسلان بہم
 مجھ کا ڈر ہے کہ نہ چھینے تر المیر سہرا (۵) باندھے سورہ اخلاص کو پڑھ کر سہرا
 (۶) تاؤ بھر کر ہا پر دے گئے ہوں گے موتی (۷) آج وہ دن ہے کہ لائے درخیم کو فلک
 در نہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا (۸) کشتی زر میں نہ تو کے لگا کر سہرا
 (۹) سات دریا کے قراہم کے ہونگے موتی (۱۰) اک گہر بھی نہیں صید کان گہر میں چھوڑا
 تب بنا ہو گا اس انداز کا گز بھر سہرا (۱۱) تیرا بنوایا ہے بے لے کے جو گز بھر سہرا
 (۱۲) رخ پر ڈولہا کے جو گرمی سے پینہ ٹپکا (۱۳) دئے رخ پر جو ہیں تیرے برستے الوار
 ہے دگ ابر گہر بار سراسر سہرا (۱۴) تار ہارش سے بنا ایک سراسر سہرا
 (۱۵) تابش من سے مانند شمع خورشید (۱۶) تابش من سے مانند شمع خورشید
 (۱۷) رخ پر نور پہ ہے تیرے منور سہرا (۱۸) رخ پر نور پہ ہے تیرے منور سہرا

(۱) یہ بھی ایک بے ادبی تھی کہ قبائے بڑھ جا
 رہ گیا آن کے دامن کے برابر سہرا
 (۲) جی میں اترائیں نہ موتی کہ ہیں ہیں ایک تیر (۳) پھرتی خوشبو سے ہے اترائی ہوئی ہادی ہا
 چاہے پھولوں کا بھی ایک منور سہرا
 (۴) جبکہ اپنے میں ساویں نہ خوشی کے مارے (۵) اللہ اللہ ہے پھولوں کا منور سہرا
 گوندے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیونکر سہرا
 (۶) نوح روشن کی دمک گوہر عطا کی چمک (۷) دھوم بے گلشن آفاق میں اس چمک کی
 کیوں نہ دکھلائے فروغ نہ و اختر سہرا (۸) گائیں مرغابن لوانج نہ کیونکر سہرا
 (۹) رونما فی بینا تجھے بے نہ زور شیل فلک (۱۰) رونا فی بینا تجھے بے نہ زور شیل فلک
 کھول دے منہ کو جو تو منہ سے اٹھا کر سہرا (۱۱) کھول دے منہ کو جو تو منہ سے اٹھا کر سہرا
 (۱۲) وہ کے علی علی یہ کے سبحان اللہ (۱۳) وہ کے علی علی یہ کے سبحان اللہ
 دیکھے کھڑے پر کھڑے جو نہ اختر سہرا (۱۴) دیکھے کھڑے پر کھڑے جو نہ اختر سہرا

(۱۵) وہ کے علی علی یہ کے سبحان اللہ
 دیکھے کھڑے پر کھڑے جو نہ اختر سہرا

غالب کا سہرا

ذوق کا سہرا

(۱۱) تار ریشم کا نہیں ہے یہ رنگ ابر بہار (۱۲) کثرتِ تارِ نعرے ہے تماشائیوں کے
 لائے گا تاب گراں باری گوہر سہرا دمِ نظارہ ترے روتے کو چہر سہرا
 (۱۳) ہم سخنِ فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں (۱۴) درخوشِ آبِ رضا میں سے بنا کر لایا
 دیکھیں اس مہرے سے کہا کوئی بہتر سہرا واسطے تیرے تیا ذوقِ شاکر سہرا

جس کو دعویٰ ہو سخن کا یہ سنا دے اس کو
 (۱۵) دیکھ اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا
 طباطبائی اور جوش ملیحانی صاحب نے ذوق کے مقابلہ میں غالب
 کے مہرے کی خوبیاں اور تقاضوں جو بیان کئے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) مصنف نے پہلے مصرع میں جو محاورہ باندھا ہے "تو سے مہر سہرا"
 ذوق نے بھی اپنے مطلع میں باندھا ہے مصنف سے یہ محاورہ پورا نہ
 بندھا اور ذوق سے پورا اترا محاورہ یہ ہے کہ تیرے مہر شاعری کا سہرا
 ہے تیرے مہر فیضیت کا سہرا ہے تیرے مہر سعادت کا سہرا ہے خالی سہرا
 کوئی نہیں کہتا جس طرح مصنف نے بخت کے مہر سہرا ہے کہا ہے جس سے
 یہ سمجھ میں آتا ہے کہ پچ پچ کا سہرا مراد ہے ذوق نے پہلے مصرع میں اصلی
 سہرا مراد لیا ہے اور دوسرے مصرع میں بین و سعادت کا سہرا "شہزادہ
 کے سر باندھا ہے۔"

اس کے بعد حضرت طباطبائی نے دوسرے مصرع کی بخت چھیر دی اور
 اس پر تقریباً ایک منہ لکھا ہے جو بالکل غیر ضروری ہے۔
 (جوش ملیحانی) ترے مہر سہرا ہے یعنی یہ عزت تجھے حاصل ہوئی ہے

شہزادے کے نام کے لحاظ سے بخت کو سہرا یا منٹے کے لئے منتخب کرنا
حسن بیان کی خوبی ہے ۔

(۷) (طیابھائی) قریب سے معلوم ہوتا ہے کہ ذوق مرحوم نے اس شعر
کی چوٹ پر کئی شعر کہے ہیں کھڑے کو انھوں نے بھی باندھا ہے ۔

وہ کہے صبل علی یہ کہے سبحان اللہ

دیکھے مکھڑے جو ترے نہ و آخر سہرا

سہرے کا بھلا لکنا انھوں نے اس طرح کہا :-

سر پہ طرہ ہے مزین تو گلے پر بدھی

لگنا ہاتھ میں زیبا ہے تو منہ پر سہرا

پھر اس پر بھی ترقی کی ہے :-

ایک کو ایک پر تزیین دم آؤش سر پر دستار سے دستار کے اوپر

اس میں شک نہیں کہ غالب نے بے مثل شعر کہا تھا مگر ذوق نے

جواب دیا اور خوب دیا شعر کا جواب تو ہو گیا اس میں شک نہیں کہ غالب

نے بے مثل شعر کہا زور کا قافیہ غالب ہی کے حصہ میں آیا ذوق نے استاد ہی

کی کہ اس قافیہ پر ہاتھ نہیں ڈالا ۔

اس کے بعد تو بٹاؤ بیڑہ صنم میں گرام کی تکلیف وہ بکثرت پھیر دیتی ہے

جو قطعاً غیر ضروری ہے اور جس کا شعر مضمون سے کوئی تعلق نہیں ۔

(جوش ملیح آبادی) کھڑا بیار کے لئے بولتے ہیں مگر یہ لفظ اکیلا بغیر محاورہ

آئے تو صحیح نہیں ہے مرزا نے چاند سے کھڑے کہہ کر محاورہ زبان ہاتھ

سے نہیں چھوڑا۔

(باقر) تیرے اس چانتے مکھڑے پر سہرا بہت ہی بھلا معلوم دیتا ہے گویا سہرا تیرے حسن دل افروز کا زیور ہے۔

(۳) (طباطبائی) لمبر ہی کہنا ٹھیک ہے نمبر غلط۔ لیکن یہ لفظ بہت مکروہ ہے شاعر کی زبان پر نہیں ہونا چاہئے۔ اس کے بعد نصف صغیہ پر نمبر پر غیر ضروری بحث کی ہے شعر کی تشریح نہیں کی۔

(باقر) لمبر۔ نمبر۔ گزشتہ صدی میں لمبر ہی مستعمل تھا۔ طرف کلاہ گوشہ کلاہ۔

اے گوشہ کلاہ تجھے شہنشاہ کے سہر پر چڑھنا سچ مح ذیب دیتا لیکن مجھے ڈر ہے کہ کہیں تیرا درجہ سہرا نہ چھین لے یعنی سہرا باندھنے سے کہیں تپتے نہ دب جائے۔

(جوش ملیح آبادی) نمبر ب معنی درجہ انگریزی لفظ ہے مگر کثیر الاستعمال ہونے کی وجہ سے اردو ملکیت بن گیا ہے ایسے اور بھی بیسیوں انگریزی لفظ ہیں جو مرزا کے عہد میں قبول عام کا درجہ حاصل کر کے فصیح ہو چکے تھے، فرماتے ہیں اے گوشہ کلاہ سر پر چڑھ کر بیٹھنے کی سر فرازی تجھے مبارک ہو۔ مگر ڈر ہے کہ سہرا تو درجہ کو نہ چھین لے سہرا چونکہ کلاہ کے اوپر ہی باندھا جاتا ہے اس لئے درجہ چھین لینے اور فوقیت حاصل کرنے کا خوف بجا ہے۔

(۴) (طباطبائی) ذوق کہتے ہیں۔

آج وہ دن ہے کہ لائے دریا بنم و فلک کشتی در میں میر لو کی لگا کر ہنسنا

کوئی تشریح نہیں کی

(جوش ملیحانی) مرزا نے یہ سہرا نہ نکار کشتی میں رکھ کر بڑے بکھن سے پیش کیا تھا۔

یہاں اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے گویا کشتی موتیوں کی ناؤ ہے جن کی لڑیاں یہ اشعار ہیں۔

(۵) (طبایطیاتی) موتیوں کا سہرا گوندھتے ہیں بناتے نہیں۔ یوں بھی ہو سکتا تھا تب گندھا ہو گا اس انداز کا گز بھر سہرا۔ نثر یا لفظ ضلع کا ہو مباد کہا جائے دیتے ہیں بولنا بے عمل نہیں ذوق نے یوں کہا ہے۔

اک گہر بھی نہیں صدکان گہر میں چھوڑا

تیرا بنوایا ہے لے لیکے جو گہر سہرا

(باقہد یا معنی سمندر۔ سات سمندروں کے موتی جمع کئے ہوں گے پھر کہیں جا کر اس انداز کا گز بھر سہرا بنا ہو گا۔ بنا کا لفظ خوب ہے۔

(جوش ملیحانی) سات دریا سے سات سمندر مراد ہیں جنہیں شارس

میں ہفت قلزم یا ہفت دریا کہتے ہیں گز بھر کا قافیہ یہ لحاظ محامدہ زبان کتنا بر محل ہے اس انداز ان نظموں میں جو معنوی وسعت ہے اس کا کیا کہنا۔

(۶) (طبایطیاتی) (پ) سہر کا تب ہے و سے یہاں چاہئے۔ بے مزہ

تشبیہ ہے پیمینہ سے اور گہر بار ہو جانا سہرے کا پیمینہ کی افراط پر ولالت کرتا ہے صمد میں اغراق و مبالغہ نامقبول ہے گرمی سے اس شعر میں گرمی جن مراد ہے اگرچہ شعر قابل التفات نہ تھا۔ مگر ذوق نے دوشعر اس کے جواب میں کہے

دے فسخ پر جو ہیں تیسرے پر بستے انوار
 تار بادش سے بٹ ایک سر اسر ہسرا
 دوسرا شعر گریح من کے بیان میں کہا ہے
 تابش جن سے مابند شایع خورشید
 نسخ پر نور ہے تیرے منور ہسرا

(جوش ملیحانی) سرے کی ہر ایک لڑی کو ابر یا ابر گریار کی
 رگ کہا جن بیان ہے پھر جن تلاش دیکھئے کہ اس ابر کے لئے موتی کہاں سے
 تلاش کئے گئے ہیں۔

(طباطبائی) اس شعر کا جواب ذوق کی غزل میں نہیں نکلتا ہاں وہی
 شعر جو گزرا

ایک کو ایک پہ تزیین ہے دم آرائش
 سر پہ دستار ہے دستار کے اوپر ہسرا
 یہاں بھی پیش کہہ سکتے ہیں کہ اس کے مثل کا کوئی شعر غالب کی غزل میں
 دکھائی نہیں دیتا۔

(جوش ملیحانی) یہ جن التعلیل ہے دامن کے برابر آکر سرے کے رگ جلنے
 کی وجہ کتنی دل نشیں اور کس قدر بر محل ہے آکر کی جگہ آن کر پرائی نہاں ہے
 مرزا کے عہد میں یہ نقطہ متروک نہ تھا ذوق نے بھی کہا ہے۔

"اے جل تکلیف مت کر کیا کرے گی آن کر"
 حق تو یہ ہے کہ ذوق نے قضا فیہ کے لحاظ سے آن کر

کہنے سے موتی جڑا دیئے ہیں۔

(باقی) یہ ایک بے ادبی تھی کہ سہرا قبا سے آگے بڑھ جاتا ہے اور وہاں سے
کہ وہ قبا کے پا پر آکر رک گیا اور آگے نہ بڑھا۔

(۴) (طباطبائی) اس شعر کا جواب ذوق نے یہ دیا ہے۔

پھرتی خوشبو سے ہے اترائی ہوئی باد بہار

اللہ اللہ سے پھولوں کا معطر ہوا

پھولوں کا لفظ بھی کہتا تھا کہ ستر سے ستر کا قافیہ بہتر ہے۔

(جوش ملیح آبادی) مقرر معنی ضروری مطلب صاف ہے۔

(باقی) ناگہ شہزادے کے ہرے میں گنڈھ کر موتی اس بات پر نہ اترا یہی

کہ ہم ہی سب کچھ ہیں اس لئے پھولوں کے ہرے کی بھی ضرورت ہے۔

(۵) (طباطبائی) اس شعر کو ادب کے شعر سے قطعہ کا سارا بط معلوم ہوتا ہے

اور علیحدہ علیحدہ بھی دونوں شعر تمام ہیں کیونکہ قافیہ ذوق نے اس طرح

باتھا ہے۔

دھوم ہے گلشنِ آفاق میں اس ہرے کی

گائیں مرغانِ نوا سب نہ کیوں کر ہوا

یعنی انہوں نے گلچیں و گل فروش کا پھولوں میں نہ سنانا ذکر کیا انہوں

نے بلبل و قمری کا خوش ہونا نظم کیا ہے اپنے میں سنانا قصداً کا محاورہ نہیں

ہے آپ میں سنانا اس سے زیادہ شریح ہے۔

(جوش ملیح آبادی) یہ شعر شعر سابق ہی کا جواب ہے کلیوں کا کھلنا گویا خوشی

کے مارے آپ میں نہ سمانا ہے! اپنے میں سمانا محاورہ نہیں ہے مطلب یہ ہے کہ پھولوں کو ضبط میں رکھنا اور سہرے کا گوئدھنا دشوار ہے۔ باقر جب خوشی کے مارے پھول اپنے میں نہیں سماتے تو پھر پھولوں کا سہرا کوئی کیونکر گوندھ سکتا ہے (تجود) کلیوں کا کھلنا گویا قبائے گل کا جوش مسترت سے چاک ہو جانا ہے اسی صورت میں سہرے کا گوئدھنا جانا دشوار ہو گیا۔

(۱۰) (طبایطی) اس شعر میں روشن کی جگہ تاباں ہوتا تو جس طرح چمک اور دمک میں سج ہے تاباں اور غلطاں میں بھی سج پیدا ہو جاتا یہ شعر بھی سہرے میں گوہر شاہ نواز کی طرح چمک رہا ہے ذوق کے دو شعروں سے اس کا جواب نکلتا ہے ایک تو مہ داخلہ والا شعر جو کہ را دو سرا مہ و خورشید والا شعر۔

(جوش ملیح آبادی) رُخ روشن کو فروغِ ماہ اور گوہر غلطاں کو فروغِ اختر سے تشبیہ دیا ہے دمک اور چمک فرق بھی ظاہر ہے۔

(باقر) ادھر رُخ روشن کی دمک ہے ادھر گوہر غلطاں کی چمک ہے پھر کھلا سہرا مہ داخلہ کی چمک دمک کیوں نہ دکھلائے۔

(۱۱) (طبایطی) یعنی رشیم کا تار ہوتا تو بھلا اتنے بڑے بڑے موتیوں کو بٹھال کھائی یہ رگ ابر ہے جو اس آب و تاب کے دریا کو بٹھالے ہے تار کا معنوں ذوق نے اس طرح کہا ہے۔

کثرت تارِ نظر سے ہے تماشایوں کے

دمِ نظارہ تیرے دوئے نکو پر سہرا

روحِ ملیح آبادی، دوسرا مصرع استفہامیہ ہے اور یہ استفہام انکاری

سہرے کی لڑی کو رنگ ابر بہار۔ سے تشبیہ اس سے پہلے بھی آچکی ہے
 ابر بہار کی رنگ موتی برساتی ہے گویا وہ موتیوں کا بوجھ برداشت
 نہیں کر سکتی۔ اسی خیال سے سہرے کی لڑی کے متعلق پوچھتے ہیں کہ کیا
 یہ لڑی اتنے موتیوں کا بوجھ برداشت کر سکے گی تشبیہ کی خوبی ظاہر ہے۔
 (باقی اس سہرے میں دشیم کا تاثر نہیں ہے بلکہ رنگ ابر بہار ہے۔
 اس لئے وہ موتیوں کے بھاری وزن کو بخوبی اٹھائے گا۔ مطلب یہ
 ہے کہ دشیم کا تاثر اس قدر موتیوں کے بوجھ کو نہیں اٹھا سکتا اور ابر بہار
 میں تو موتی ہی برسا کرتے ہیں۔

(۱۲) (جوش ملیح آبادی) یہ صنعت تجزیہ ہے مقطع فخریہ کہا ہے لفظ سخن فہم
 یہاں کتنا ضروری اور کتنا استنادانہ ہے اس کے بعد ملیح آبادی صاحب
 نے اس سہرے کی شان نزول فرمائی ہے اور ایک ایسا من گھڑت واقعہ
 روایت محل سے منسوب کیا ہے جس کی کوئی حقیقت ہی نہیں)

طباطبائی۔ جواب اس کا ذوق نے دو شعروں میں دیا ہے۔

دُر خوش آب مضامین سے بنا کر لایا
 واسطے تیسرے ترا ذوق بنا کر سہرا

جس کو دعویٰ ہے سخن کا یہ سنا دے اس کو

دیکھ اس طرح سے کہتے ہیں سخن در سہرا

باقی۔ ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں کہ اس کی رو رعایت کریں۔
 بلا دیکھیں اس سہرے سے بڑھ کر کوئی سہرا کہہ سکے مطلب یہ ہے کہ اس سے

بہتر سہرا لکھنا ناممکن ہے۔ یہ غالب ہی کا حق ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ذوق نے غالب کے جواب میں محکم بادشاہ عمدہ اور شاندار سہرا لکھا ہے مگر یہ نہیں کہ غالب سے بڑتر ہے غالب کا سہرا اپنی جگہ بے مثال ہے آفتاب کی طرح درخشاں۔ تازہ پھولوں کی طرح معطر اور مختلف قسم کی صنعتوں سے بھرپور اور نادر خیالات کا مجموعہ ہے اور ذوق رفعت خیالی میں غالب کا مقابلہ نہیں کر سکتے شعر نمبر (۳) اور غیر کا جواب ہی ذرا لیکے اور شعرے اور غے اور غے کا جواب انہوں نے دو دو شعروں میں دیا ہے جس کو شاعرانہ کمزوری پر محمول کیا جاسکتا ہے جوش کیانی صاحب نے اپنی طرف سے ایک من گھڑت واقعہ لکھا ہے

”نواب زینت محل کو جب اس سہرے کا علم ہوا تو انہوں نے دربار کو تاکید کر دی کہ ذوق کا سہرا جب پڑھا جائے تو کسی شعر کی داد نہ دی جائے مگر یہ تنگ دلا نہ کوشش بے سود ثابت ہوئی“

ایسا غلط ہے بنیاد اور غیر تاریخی واقعہ کہنے سے غالباً یہ مقصد تھا کہ محمد بن آزاد مصنف آب حیات سے اگر کوئی فرو گذاشت اپنے استاد ذوق کی تعریف میں ہو گئی ہے تو وہ پوری کی جائے اس لئے کہ جوش کیانی صاحب کے استاد ہیں داغ اور داغ کے استاد ذوق تھے پھر وہ غالب اور عا د استاد ذوق کے مقابلہ میں غالب کو کس طرح برتر اور اعلیٰ شاعر مان سکتے ہیں۔

سہروں کا مقابلہ کرتے وقت اس بات کو مد نظر رکھنا چاہئے کہ :-

(۱) غالب سہرا لکھنے کے موجد میں اس سے پیشتر اردو زبان تو کیا غیر
زبانوں میں بھی سہرا نظر نہیں آتا اس لئے اولیت اور ایجاد کا سہرا
غالب ہی کے سر ہے۔

(۲) ان کا مقصد بادشاہ کو تکلیف دینا ذوق سے مقابلہ کرنا تھا۔
بسیا کہ وہ خود معذرت میں لکھتے ہیں۔

ستادِ شہ سے ہو مجھے پر غاش کا خیال
بتاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے

سہرا لکھا گیا ہے نہ رو متبثالِ امر
دیکھا کہ چاہے غیرِ اطاعت نہیں مجھے

قطع میں آپڑی ہے سخن گزرا نہ بات
قصود اس سے قطع محبت نہیں مجھے

روئے سخن کسی کی طرف ہو تو رو سیاہ
سورا نہیں جنوں نہیں دشت نہیں مجھے

صاویق ہوں اپنے قول میں غالب خدا گواہ
کہتا ہوں بچ کہ مہوٹ کی عادت نہیں مجھے

اس معذرت میں بھی انہوں نے یہ تسلیم نہیں کیا کہ میرے سہرے میں
بڑی کمی ہے مرزا کا شربِ صلح کل تھا وہ کسی کی دل شکنی نہیں کرنا چاہتے تھے
اس لئے انہوں نے معذرت لکھ کر ذوقِ اصحابِ شاہ کا دل صاف کرنے کی
وشش کی جیسا کہ انہوں نے خود لکھا ہے۔

آزاد رہوں اور میرا مسلک ہے صلح کل

ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے

(۳) ذوق نے جواب میں سہرا لکھا ہے اس لئے ہر شعر کا جواب دینے اور ہر شعر سے بہتر شعر کہنے کی کوشش کی ہے اور ان کے بعض اشعار بہتر بھی ہیں پھر بھی وہ غالب کے اشعار کا اچھی طرح جواب نہیں دیکے۔

(۴) بادشاہ نے ادب و نشاط سے پڑھوا کر اور گانے میں ذوق کا سہرا سنوا کر اس کی شہرت کی ورنہ آج بھی ذوق کا سہرا موجود ہے اس کو غالب کے مقابلہ میں قبولیت عوام حاصل نہیں ہے۔

(۵) محمد حسین آزاد نے آپ حیات میں ذوق کے سہرے کی خوبیاں لکھ کر اس کو عوام میں روشناس کرایا ورنہ وہ بھی ذوق کے دوسرے کلام کی طرح گنہام ہوتا۔

بہر حال ان دونوں صاحب کمال شاعروں کے کلام کا مقابلہ کرتے وقت انصاف کو مدنظر رکھنا چاہئے جانبداری سے کام لینے میں خوبیاں بھی برائیاں بن جاتی ہیں بالکل اسی طرح جیسے جوش ملیحالی صاحب کے غالب کے کلام پر تبصرہ اور تنقید کرتے ہوئے ان کی بہت تعریف کی ہے لیکن ذوق سے مقابلہ کرتے وقت انھوں نے ذوق کو تگے بڑھانے کی کوشش کی ہے ذوق کی صرف ایک غزل اور سہرے غالب کے تمام کلام اور کمال پر پانی پھیر دیا ہے جناب طباطبائی صاحب سہرے کے اشعار کے مطالب کی تشریح کرنے کے بجائے ذوق کے اشعار پیش کرتے ہیں غالب کے اشعار کی

تشریح نہیں کرتے۔ ہونا یہ چاہئے تھا کہ طباطبائی صاحب یا دیگر شاعرین جب دیوانِ ذوق کی تشریح کرتے تو ان کے کلام کی خوبیاں بیان کرتے وقت ذوق کا سہرا لکھتے اور غالب اور ذوق کا موازنہ کرتے لیکن یہ الٹی بات لکھی کہ دیوانِ غالب اور ان کے کلام کی شرح لکھ رہے ہیں اور مقابلہ میں ذوق کے اشعار پیش کر رہے ہیں یہ غالب کے کلام کے ساتھ استہزا نہیں تو ادا کیا ہے۔

جس تنقید نگار کو ذوق کی ایک غزل اور ذوق کا سہرا غالب کے کلام کے مقابلہ میں پیش کرتا ہے گویا ذوق کا یہ کارنامہ یعنی ایک غزل اور ایک سہرا غالب کے تمام کلام پر بھاری ہے۔ اور غالب کا باقی کلام قابلِ التفات ہی نہیں۔ مقابلہ کیجئے دیوانِ ذوق اور دیوانِ غالب کا ہم وزن، ہم ردیف اور ہم قافیہ غزلوں کا۔ رفعت خیال کا۔ شاعرانہ نازک خیالیوں کا۔ تب معلوم ہوگا ان بالکالوں کے کلام میں کیا کیا خوبیاں ہیں۔

غالب کا معذرت نامہ

ذوق نے بادشاہ کے حکم بموجب سہرا لکھا مقطع میں اسی طرح مقطع کا جواب دیا غالب کو ذوق کے سہرے کی خبر لگی تو وہ بہت گھبرائے ان کا مقصد کسی کی دشمنی یا کسی پر حملہ نہیں تھا جیسا کہ شاعروں کا طریقہ ہے انہوں نے بھی سہرے کا مقطع تفاخر کے انداز میں لکھ دیا تھا انہیں اس بات کا خیال بھی نہ تھا کہ یہ مقطع بادشاہ کے طال کا سبب بن جائے گا یا ذوق پر حملہ کے مترادف

سمجھا جائے گا مرزا کا شربِ تلخ کل تھا ہندوؤں نے ایک معذرت
 لکھی اور بادشاہ کے حضور میں گزرائی معذرت دیکھ کر بادشاہ کا دل صاف
 ہو گیا۔

معذرت

مختور ہے گزارشِ احوال واقعی مجھے
 اپنا بیان من طبیعت نہیں مجھے

سودشت سے ہے پیشہ آبا پہ گرمی
 کچھ شاعری زریبِ عنایت نہیں مجھے

آقا و دہ ہوں اور مرا مسک ہے صبح کل
 ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے

کیا کم ہے یہ شرفِ کونکر کا غلام ہوں
 مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے

استادِ شہ سے ہو مجھے پر خاش کا خیال
 یہ تاب یہ خیال یہ طاقت نہیں مجھے

جامِ جہاں نما ہے شہنشاہ کا غمیر
 سو گند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے

میں کون اور رنجیتہ ہاں اس سے مدعا
 جزا نبیادِ خامِ حضرت نہیں مجھے

سہرا لکھا گیا زرہ استمالِ امر
 دیکھا کہ جاہِ غمیرِ اطاعت نہیں مجھے

قطع میں آپڑی ہے سخن گستر ادبات
مقصود اس سے قطعِ نعت نہیں مجھے

روئے سخن کسی طرف ہو تو رو سیاہ
سودا نہیں جنوں نہیں وحشت نہیں مجھے

قمت بڑی ہستی پر طبیعت نہیں پڑی
ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے

صاوق ہوں اپنے قول میں غالب خدا گواہ
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

اس معذرت کے اشارے ایسے نہیں جو پڑھنے والوں کی سمجھ میں نہ
آسکیں نہ ان کے دقیق مطالب ہیں جن کی شرح کی ضرورت ہو لیکن حضرت
طباطبائی اور جوش ملیح آبادی نے جو ان اشارے کو سننے سے پہچانے ہیں ان کو
سن کر غالب کی روح پھر تک گئی ہوگی ذرا آپ بھی ان حضرات کی تشریح
کی داد دیجئے۔

۱۔ طباطبائی - یعنی احوال واقعی کی گزارش مجھے منظور ہے نہ کہ اپنی حسن
طبیعت کا بیان لیکن شعر کی تلاش اُلٹھی ہوئی ہے۔ (جوش ملیح آبادی) اس
تکلم میں اصل معاملہ کرنا منظور ہے اپنے حسنِ طبیعت کا بیان مجھے یہاں منظور
نہیں ہے۔ ایک علیحدہ مضمون ہے۔

(۷) (جوش ملیح آبادی) یعنی اہلِ صیفت کا درجہ اہلِ قلم سے زیادہ ہے اس لئے
میں اپنے باپ دادا کے جگہ کارناموں پناہ کرتا ہوں وہ اور بول گئے جو قلم

یا شاعری کو ذریعہ عزت سمجھتے ہوں گے۔

یہاں یہ چوٹ ہے کہ ذوق شاعری میں بادشاہ کے تنخواہ دار رشتہ تھے اور اس تقریب کو ذریعہ عزت سمجھتے تھے مرزا نے یہ ذریعہ عزت لطیف پیرائے میں ٹھکرا دیا ہے۔

(طباطبائی) یعنی اہل سیف اہل قلم سے زیادہ عزت رکھتے ہیں۔
(۳) جوش طیبانی۔ آزاد وہ رو۔ یعنی آزاد روش یا فراخ دل۔ عداوت نہ ہونے کی تاکید کے لئے تین لفظ لاکر زور پیدا کیا ہے ہرگز، بھی کسی۔ گویا اپنے صالح کل ہونے کا یقین دلایا ہے۔

(طباطبائی) عداوت نہ ہونے کو تین لفظوں سے موکد کیا ہے، ہرگز سے مطلق تاکید ملتی ہے (کبھی) سے ہر زمانہ کا استیعاب کیا ہے (کسی) سے ہر شخص کا استیعاب کیا ہے اور آزاد سے آزاد روش مراد ہے۔

(۴) جوش طیبانی، دوسرے مصرعے میں حاصل کو محذوف کرنا اچھا معلوم نہیں ہوتا۔ فرماتے ہیں یہ شرف کہ میں بادشاہ کا غلام ہوں میرے لئے کم سچیں پھر کیا ہیں ویوانہ ہوں یا کسی اور عزت و شرف کی تشاکروں۔ یا شاعری کو ذریعہ عزت سمجھوں۔ اگرچہ یہ درست ہے کہ اور غلاموں کی طرح مجھے مرتبہ منصب اور دولت حاصل نہیں ہے۔

(طباطبائی) مطلب یہ ہے کہ غلامی کا شرف میرے لئے کیا تھوڑا ہے جو شاعری کو ذریعہ عزت خیال کروں گویا یہ سچ ہے کہ اور غلاموں کی طرح مجھے ثروت و منصب نہیں۔

(۵) جوش ملیحائی اس شعر کا انداز بیان حقیقت اور طنز دونوں پہلو رکھتا ہے طنز کے طور پر بھی کہا کرتے ہیں کہ ہماری کیا مجال ہے ہماری کیا طاقت ہے وغیرہ مثلاً اس شعر میں ۔

توبہ توبہ میں تمہیں کافر کہوں
یسی گستاخی تمہاری شان میں

اس شعر میں بھی طنز کا پہلو موجود ہے استاد شہان الفاظ میں بھی طنز ہے کہ میں ذوق کا مقابلہ کر سکتا ہوں مگر بادشاہ کے استاد کا مقابلہ نہیں کر سکتا ۔

(طباطبائی) اس قطعہ میں جس پہلو سے معنی استعطاوت کو مصنف نے باندھا ہے قابل اس کے ہے کہ اہل قلم اس سے استفادہ کریں ایسے پہلو شاعر کے سوا کسی کو نہیں سوچتے یہ عرش کے خزانہ سے نکلتے ہیں ۔ اور اس کی کچھ شاعروں کے سوا کسی کے پاس نہیں لیکن نثر کی سبھی کو ضرورت ہے اور جس جس مضمون پر نثار کو قلم اٹھانا پڑتا ہے ان مضامین کی تہذیب و تمدن شاعروں کی خوشہ چینی کے بغیر نہیں ہو سکتی اب اس کے بعد پدم صفحہ پر بالکل غیر متعلق بحث چھیڑ دی ہے جس کا ادھر کے شعر سے کوئی تعلق نہیں ۔

(۶) جوش ملیحائی، جام جہاں نامی جہشید کے پالے میں کل دنیا کا حال نظر آ جاتا تھا فرماتے ہیں قسم کھانے یا گواہ پیش کرنے کی مجھے کیا ضرورت ہو بادشاہ کا دل خود ہی جام جہاں ناما ہے اور حقیقت حال اس سے مخفی نہیں یعنی وہ خود جانتا ہے کہ سہرا کون سا اچھا ہے اور شاعرانہ قابلیت کس میں

زیادہ ہے۔

طباطبائی۔ غوی لوگ تو ضمیر کو مؤنت بولتے ہیں مگر وہ ضمیر اور معنی پر ہے مرزا نے یہاں ضمیر کو دل کے معنی پر لیا ہے اور دل لفظ مذکر ہے۔
(۷) جوش ملیحائی۔ مرزا اردو میں شعر کہنا پسند کرتے تھے دوستوں کو خطوط بھی فارسی میں لکھتے تھے اور فارسی شاعری پر ان کو ناز بھی تھا چنانچہ ذوق کو مخاطب کر کے کہتے ہیں۔

فارسی ہیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگزد از مجموعہ اردو کہ بے رنگ من است
راست می گویم دے از راست سرتواں کشید
ہرچہ در گفتار فخر تست آں رنگ من است

آخری مصرع میں جو کچھ کہا گیا ہے اسی کا خاکہ شعر زیر بحث میں ہے
قرماتے ہیں کہاں میں اور کہاں اردو کی شاعری کبھی کبھی اس زبان میں جو
کچھ کہتا ہوں تو حضور کی فرمائش یا حضور کے دل کو خوش کرنے کے لئے کہتا
ہوں اس کے سوا میری اردو شاعری کوئی اور مدعا نہیں رکھتی اردو شاعری
کی یہ تعبیر بھی ذوق کی اردو شاعری پر نازیانے کا کام دے رہی ہے۔

(طباطبائی) میں کون اور رنجیت یعنی مجھے رنجیت کہنے سے کیا واسطہ کہاں
میں کہاں رنجیت کوئی مجھے تو فارسی کا ذوق ہے فقط آپ کی خوشی کرتا ہوں
جو اردو کہتا ہوں۔

(۸) جوش ملیحائی۔ اپنی بریت کے ثبوت میں فرماتے ہیں کہ سہرا میں نے

حکم کی پیروی اور دانش کی تعمیل میں لکھلپے میں نے دیکھا کہ حکم ماننے کے سوا
 چارہ نہیں ہے یہی ایک بات میری بے گناہی اور پوری فرماں برداری کے ثبوت
 میں کافی ہے مطلب یہ ہے کہ میں نے ارادے یا نیت سے چھڑ نہیں کی۔
 (۹) رجوش ملیحانی (مقطع میں اتفاق سے ایک شاعرانہ تعلق اور خود ستائی
 زبان سے نکل گئی شاعر اسی تعلق اور خود ستائی ہمیشہ کرتے ہیں اور اس کے
 ثبوت میں صد ہا مثالیں موجود ہیں اس سے یہ مقصد نہیں ہے کہ میں کسی سے
 محبت توڑ دوں۔ — ان الفاظ سے ظاہر ہے کہ اتفاقاً ایسا ہوا ہے
 ارادہ ایسا نہیں ہوا۔

(طباطبائی) ۸ و ۹ معنی مقطع کا مصرع دیکھیں اس سہرے سے
 کہہ دے کوئی بہتر سہرا ایک سخن گسترانہ بات ہے اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ
 واقع میں میرا یہ خیال ہے اور شاعروں میں باہم دگر ایسے امور اکثر پیش
 آجاتے ہیں۔

ایک دفعہ میر نہیں نے ایک رباعی میں فرمایا۔
 روتے ہیں ریا سے مجلس میں جو انیس
 اشک ان کے بھی موتی ہیں مگر جھوٹے ہیں
 مرزا دپیر نے یہ جواب دیا۔

اں اشک ریا کی کا بھی ہے مول بہشت
 سوتی سچے ہیں جو ہری جھوٹے ہیں
 اس شعر سے صاف صاف یہ بات معلوم ہوگئی کہ اردو فارسی کے

شعر میں جو مضمون ہوا اسے شاعر کا عندیہ مافی الضمیر نہیں سمجھتے ہیں لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ غزل کے اشعار میں البتہ شاعر جو کہہ جائے مرفوع القلم ہے مگر مقلع میں جو کچھ وہ کہتا ہے اسے اس کا قول اور مافی الضمیر اور مقصدہ اور عندیہ سب لوگ سمجھتے ہیں۔

(اس کے بعد تقریباً دو صفحے پر طباطبائی صاحب نے غیر متعلق باتیں لکھی ہیں۔
(۱۰) (جوش ملیح آبادی) دوئے سخن یعنی کسی طرف اشارہ کر کے بات کہی رو سیاہ
یعنی گہنگار۔

اس میں نکتہ یہ ہے کہ ذوق کا رنگ سیاہ تھا اور مرزا گندمی رنگ کے تھے سودا کی بیماری میں بھی خون سیاہ ہو جاتا ہے یہ درپردہ طنز بہت پر نطف ہے۔

(طباطبائی) یعنی ایسا دیوانہ تھا کہ استاد بادشاہ ذوق سے پر خاش و قطع محبت کرتا وہ کیا کسی کی طرف دوئے ہو تو قلم کی طرح منہ کاٹا ہو۔

(۱۱) (جوش ملیح آبادی) طبیعت سے شاعرانہ طبیعت مراد ہے یہاں بھی یہ اشارہ ہے کہ سہرا میرا ہی اچھا ہے مگر بدقسمتی سے اس کی قدر نہیں پھر بھی شکر کرتا ہوں کہ اپنی بدقسمتی کی مجھے شکایت نہیں ہے۔

(طباطبائی) یہ شعر مصنف کی بلاغت کی سند اور استاد می کی دستاویز ہے۔

اس کے بعد (پ ۳ صفحے) ادھر ادھر کی غیر متعلق باتیں لکھنے میں صرف کر دیئے ہیں۔

(۱۲) (جوش ملیحانی) یعنی جو باتیں میں نے اوپر کے اشعار میں کہی ہیں ان کی صداقت پر خدا شاہد ہے میں نے جو کچھ کہا ہے بالکل سچ کہا ہے جھوٹ بولنے کی مجھے عادت نہیں ہے۔

(طباطبائی) کہ اس مصرعہ یا بیان کے واسطے ہے یعنی کہتا ہوں سچ یہ بات کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے۔ یا توجیہ و تعلیل کے واسطے ہے یعنی جو کچھ میں کہہ رہا ہوں سچ کہہ رہا ہوں مجھے جھوٹ کی عادت نہیں یعنی سچ بولنے کی وجہ اور علت یہ ہے کہ جھوٹ کی عادت نہیں اور دونوں معنی میں سے یہی معنی مصنف کو غالباً مطلوب نہیں۔ گو حاصل دونوں صورتوں کا ایک ہی ہے لیکن اتنا فرق ہے کہ پہلی صورت میں بالزام مطلب حاصل ہوتا ہے اور وہ پھیر کا راستہ ہے یعنی جو بات کہ سچ کہتا ہوں وہ یہ ہے کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے اور جب یہ بات سچ ہوئی تو اس پر بھی لازم آیا کہ جو کچھ کہہ رہے ہیں جھوٹ نہیں ہے اور جب یہ معلوم ہوا کہ جھوٹ نہیں ہے تو اس سے یہ لازم آیا کہ سچ ہے اور دوسری صورت میں بالمطابق مطلب حاصل ہو جاتا اور سیدھی راہ ہے یعنی جو کچھ میں کہہ رہا ہوں پھر اس کی وجہ بیان کی کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے جس سہرے کے سبب ذوق مرحوم کو اور ہمارا در شاہ مغفور کو مصنف سے ملال ہوا تھا اور رفع ملال کے لئے مصنف نے یہ قطعہ کہا تھا۔

میں نے اس سہرے کو بھی اس قطعہ کے بعد دیوان میں مندرج کرنا مناسب سمجھا تا کہ مصنف کا تمام کلام اردو کا ایک ہی جگہ جمع ہو جائے۔

جوش ملیحانی اور طباطبائی صاحب نے جو معنی کے اشعار کی شرح

سپر قلم کی ہے اور جو معافی اپنی طرف سے بیان فرمائے ہیں شاید غالب کو بھی انکا علم نہ ہوگا غالب اگر زندہ ہوتے تو یقیناً ان بزرگوں کے ہاتھ پر بیعت کرتے اور ان کو اپنا استاد سمجھتے کہ جو معافی ان کے ذہن میں بھی نہ تھے وہ ان دو بالکمالوں نے لکھے اور اپنی معلومات کے دریا بہا دیئے آپ خود ان اشعار کے مفہوم کو سمجھئے پھر ان حضرات کے معافی ملاحظہ فرمائیے تو آپ کو وہ لطف آئے گا کہ آپ اپنے دوستوں کو بھی اس لطف سے محروم نہ کریں گے خصوصاً طباطبائی کے آخری شعر کی تشریح میں جھوٹ اور سچ اتنی بار آیا ہے کہ الفاظ کو بار بار دیکھ کر سر جھکانے لگتا ہے۔

یہ غالب کے کوئی شکل اشعار نہ تھے جن کی اتنی لمبی چوڑی اور بے معنی تشریح کی گئی بیان غالب میں جناب آغا محمد باقر صاحب ایم، اے، نے جو تشریح کی ہے اس میں اپنی طرف سے کوئی ایک لفظ نہیں بڑھایا۔ شعر سے جو مفہوم واضح ہوا وہ اُنھوں نے بلا کم و کاست بیان کر دیا۔ اور یہی شرح کا مطلب ہوتا ہے کہ جو کچھ شاعر کے الفاظ ہیں ان ہی کا مطلب یا شرح لکھی جائے۔

باقر صاحب کی شرح ملاحظہ ہو۔

۱۔ مجھے اپنا واقعی حال عرض کرنا مقصود ہے یہ حقیقت ہے کہ مجھے اپنے حسنِ طبیعت کا بیان منظور نہیں۔

۲۔ میرے آباء و اجداد کا پیشہ سو سال سے سپاہ گری ہے اور یہی پیشہ میرے لئے باعثِ فخر ہے میں شاعری کو ذریعہ عزت نہیں

- سمجھنا مستحب یہ ہے کہ اہل سیف اہل قلم نے یاد دہنہ کر سکتے ہیں ۔
- ۲۔ میں ایک آزاد و انسان ہوں اور میرا طریقہ صلح کل ہے میں کسی کا دل نہیں دکھاتا۔ اور میں سرگز کسی سے عداوت و بغض نہیں رکھتا۔
- ۳۔ یہ سچ ہے کہ مجھے عزت مرتبہ اور دولت مندی حاصل نہیں لیکن یکساں کم اعزاز ہے کہ میں ابو ظفر بادشاہ کا غلام ہوں۔
- ۵۔ بادشاہ کا غلام ہوتے ہوئے مجھے بادشاہ کے استاد سے پرچا ہوتا تو۔۔۔ یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے۔
- ۶۔ بادشاہ کا دل جام جہاں نما ہے اس میں وہ سر چیز کی حقیقت دیکھ سکتا ہے اس لئے مجھے اپنی بریت کے لئے قسم کھانے اور گواہ پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔
- ۷۔ بھلا مجھے رنجیتہ گوئی سے کیا واسطہ کہاں میں کہاں رنجیتہ گوئی میں توفار کا شاعر ہوں ہاں صرف خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اردو میں کہہ لیتا ہوں۔
- ۸۔ امثال امر یعنی تعمیل حکم محض حضور کے حکم سے یہ سہرا لکھا گیا ہے اور وہ بھی اس وقت جب میں نے دیکھا کہ سوائے تعمیل حکم کے کچھ چارہ نہیں۔
- ۹۔ سہرے کے منقطع میں محض ایک شاعرانہ اور سخن گسترانہ بات اڑی ہے ورنہ اس سے میرا مقصد یہ ہرگز نہیں کہ میں محبت کے راہ و رسم منقطع کر دوں۔

- ۱۰۔ اگر میں نے اس مقطع میں کسی پرچوٹ کی ہو تو کا لامنہ ہو میں کوئی دیوانہ
نہیں مجنوں نہیں، جیسی نہیں کہ کسی فصیح حرکت کرتا۔
- ۱۱۔ مانا کہ میری قسمت بُری ہے لیکن میری طبیعت بُری نہیں یہ شکر کا مقام
ہے کہ مجھے کسی سے اس بات کی شکایت نہیں۔
- ۱۲۔ خدا گواہ ہے کہ میں اپنے قول کا سچا ہوں اور میں سچ کہتا ہوں کہ مجھے
جھوٹ بولنے کی عادت نہیں ہے۔

آپ نے خود غور فرمایا ہو گا کہ غالب کی معذرت سے یہ کہیں ظاہر نہیں
ہوتا کہ ان کا سہرا استاد ذوق سے کم درجہ کا ہے۔ یا ذوق کا سہرا ان سے
بہتر ہے۔ مرزا نے سہرے کے متعلق کچھ نہیں لکھا بلکہ مقطع میں جو شاعرانہ تعلی کی
تھی اور جس سے شکایت پیدا ہو گئی تھی اس کو رفع کرنے کی کوشش کی ہے۔
مرزا کا مشرب صلیح کل تھا۔ وہ کسی کا دل دکھانا نہیں چاہتے تھے انھوں نے
معذرت نامہ لکھ دیا کہ جن لوگوں کو تکلیف پہنچی ان کا دل مرزا کی طرف سے
صاف ہو جائے۔ چونکہ مرزا نے معذرت نامہ خلوص اور سچائی کے ساتھ لکھا تھا
جسے دیکھ کر بادشاہ کا دل مرزا کی طرف سے صاف ہو گیا۔ بلکہ مرزا کا درجہ اور
غلند ہو گیا کہ ان کو خطاب دے کر شاہانِ تہذیب کی تاریخ لکھنے پر مامور کر دیا گیا۔